اقبالیات (اردو)

جولائی تا ستمبر، ۱۹۸۱ء

مدیر:

ڈاکٹر محمد معزالدین

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جولائی تا ستمبر، ۱۹۸۱ء)
مدیر	:	محمد معزالدین
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	لاہور
سال	:	۱۹۸۱ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۱۲۸
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

Iqbal Academy Pakistan

(www.iap.gov.pk)

6th Floor Aiwan-e-Iqbal Complex, Egerton Road, Lahore.

مندرجات

جلد: ۲۲ | اقبال ریویو: جولائی تا ستمبر، ۱۹۸۱ء | شمارہ: ۲

مندرجات

☆☆☆☆☆

اقبال ریویو

مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان

یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم وفنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انہیں دلچسپی تھی، مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، فن، آثاریات، وغیرہ

بدل اشتراک

(چار شماروں کے لیے)

پاکستان 15 روپیہ

بیرونی ممالک 5 ڈالر یا 1.75 پونڈ

قیمت فی شمارہ

4 روپیہ 1.50 ڈالر یا 50. پونڈ

مضامین برائے اشاعت

معتمد مجلس ادارت، ''اقبال ریویو'' 116 میکلوڈ روڈ لاہور کے پتے پر ہر مضمون کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ دار نہ ہوگی۔

ناشر: ڈاکٹر محمد معز الدین، مدیر و معتمد، مجلس ادارت و ناظم، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ـــــــــ مطبع: زرین آرٹ پریس، 21 ریلوے روڈ لاہور

اقبال ریویو

مجلہ اقبال اکادمی پاکستان

جلد 22　　جولائی 1981　　بمطابق رمضان المبارک 1401　　نمبر 2

ہمارے قلمی معاونین

☆ جناب محمد علی خان	وفاقی وزیر تعلیم پاکستان
☆ جناب جسٹس کریم اللہ درانی	جج وفاقی شرعی عدالت
☆ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	لاہور
☆ جناب محمد عبداللہ قریشی	اقبالیات کے معروف سکالر
☆ پروفیسر محمد نواز طائر	ڈائریکٹر، پشتو اکادمی، پشاور
☆ جناب عطا شاد	ڈائریکٹر، آرٹ کونسل، کوئٹہ
☆ جناب پریشان خٹک	وائس چانسلر گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان
☆ جناب سرجیت سنگھ لانبہ	نئی دہلی (بھارت)
☆ ڈاکٹر آغا یمین	شعبہ فارسی، گورنمنٹ کالج، لاہور
☆ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد	ممتاز ماہر اقبالیات و معروف بھارتی ادیب

اقبال ایک پیامی شاعر *

محمد علی خان

اقبال ایک پیامی شاعر تھے اور ان کا پیغام ابتداء، ایک ایسے گروہ کے لیے تھا جو مخصوص تاریخی عوامل کے زیر اثر سعی و عمل سے کنارہ کش ہو چکا تھا 1857 کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی پس پائی محض ایک سیاسی سانحہ نہ تھا بلکہ اس نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں سے جینے کی امنگ چھین لی تھی اقبال سے پہلے حالی اور اکبر نے بیمار قوم کے مرض کی تشخیص تو کر لی تھی لیکن وہ اس مرض کے اصل سبب کو نہ پہچان سکے اکبر نے اس کا سبب مذہب سے انحراف بتایا اور حالی نے کہا کہ وہ اجتہاد فکر اور وسعت نظر چھوڑ کر تقدیر پرست اور تنگ خیال بن گئے ہیں حالی اور اکبر کے علاوہ مولانا شبلی نے بھی اس بات کو محسوس کیا کہ ترقی یافتہ قوموں کے تہذیب و تمدن کو اپنانے اور ان کی روایات کی پیروی کرنے کے بجائے اگر مسلمان صرف اپنے ہی ماضی کا مطالعہ کریں اور اپنی ہی روایات کا دامن تھامیں اور اس کے ساتھ زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دیں تو دنیا کی کسی بھی متمدن قوم سے آگے نکل سکتے ہیں، بلکہ شبلی نے تو یہاں تک کہا کہ دوسری قوموں کی ترقی کا راز آگے بڑھنے میں ہے مگر مسلمانوں کی ترقی کا راز پیچھے کی طرف پلٹنے میں ہے، اور یہی مسلمانوں کے ماضی کے شاندار ہونے کا بین ثبوت

---

* 9 نومبر 1980 کو اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے

ایک سوتیسرے یوم پیدائش کے موقع پر پنجاب یونیورسٹی کے سینیٹ ہال میں ایک اجلاس منعقد ہوا یہ جناب محمد علی خان، وفاقی وزیر تعلیم، کے خطبہ صدارت کا متن ہے

ہے علامہ اقبال کو جو بات دوسرے شاعروں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو ان کی ابتر حالت کا احساس دلاتے ہوئے کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ ہمیشہ اس بات کا درس دیا کہ زندہ قوموں کو زمانے کے تغیرات اور انقلابات سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ انقلابات ایک فطری عمل ہیں حکومتیں بدلتی رہتی ہیں

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارہ

مگر زندہ قوموں کو جدوجہد اور عمل سے کبھی منہ نہیں موڑنا چاہیے یہی ان کی بڑائی ہے البتہ اگر کوئی قوم اپنے آپ کو عمل سے محروم رکھ لیتی ہے اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتی تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مسلسل جدوجہد سے انسان کی ذہنی اور عملی قوتیں برابر تیز ہوتی رہتی ہیں اور اس کے سینے میں خودی کا شعلہ روز بروز روشن تر ہوتا جاتا ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

ساز تخلیق مقاصد زندہ ایم

از شعاع آرزو تابندہ ایم

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عمل کے لیےلگن کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے اقبال کی اصطلاح میں ''عشق'' کہتے ہیں عشق سے اقبال کی مراد تخلیق ذوق وجدان ہے یہ شدت احساس کی ایسی حالت کا نام ہے جونہایت پراسرار طریقے سے انسانی شخصیت کولازوال بنا دیتی ہے۔

---

1 ''کلیات اقبال اردو''(''بانگ درا'')ص180

---

2 ایضاً،ص174

---

3 ''کلیات اقبال فارسی''(اسرار خودی)ص 17-15

یہی جذبہ انسان کومعراج حیات عطا کرتا ہے یہی سوز حیات ہےاور یہی ساز حیات اوررزم گاہ حیات میں اس کی بدولت اعلیٰ مقاصد کاحصول ممکن ہے

اقبال کا پیغام ایک حیات تازہ ، پرجوش ولولے اورامنگ سے بھرپور ہےاور یہ پیغام عصری تقاضوں اورملت کے افراد کی ظاہری حالت کو بدلنے کے لیے اشد ضروری تھا علامہ کو پختہ یقین تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل نہایت شان دار ہےاور دنیا کی آئندہ امیدوں کا دارومدار انہی پر ہے انہوں نے قوم کوتوحید، اخوت،عمل اور عشق کا سبق دیا ان کے نزدیک انسان کی خودی کی تکمیل اورفردوملت کا حقیقی ربط صرف اسلام ہی کے ذریعےممکن ہے،جس میں فرداورملت کا تعلق نسل یا وطن کا محدودتصورنہیں بلکہ توحیداوررسالت کا ہمہ گیرعقیدہ ہے۔فردکوحقیقی آزادی ملت

اسلامی ہی کے اندر حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس ملت نے نوع انسانی کو حقیقی معنوں میں حریت، مساوات اور اخوت کا عملی نمونہ پیش کیا۔۔۔ایک ایسی مساوات جو رنگ و نسل، حسب و نسب اور معاشرتی امتیازات سے بے نیاز ہے۔

علامہ اقبال کی تاریخ عالم پر گہری نگاہ تھی وہ اقوام عالم کے عروج و زوال سے پوری طرح واقف تھے ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کے اجزائے ترکیبی میں ابدیت کے ایسے عناصر موجود ہیں جو اسے کبھی شکست و فنا سے دو چار نہیں ہونے دیں گے اقبال کے پیغام کی رجائیت کے سوتے اسی احساس ابدیت سے پھوٹتے ہیں

در جہاں بانگ اذاں بود ست و ہست

ملت اسلامیاں بود ست و ہست

اقبال کی شاعری کا یہ خاص رنگ کسی تعصب، تنگ نظری یا فرقہ پرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ عالم انسانیت کی بقا اور فلاح کے اس خواب سے مربوط ہے جو اقبال زندگی بھر جاگتی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ان کے زمانے کے حوادث و واقعات نے بھی ان کو اس خاص نہج پر سوچنے

---

4 ایضاً (''رموز بے خودی'') ص 120

کے لیے مجبور کیا

اقبال کو اچھی طرح علم تھا کہ کوئی انقلاب اس وقت تک ٹھوس شکل اختیار نہیں کر سکتا جب تک عام انسانوں کے خیالات میں تبدیلی رونما ہو اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ملت اسلامیہ کو ان خطرات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا جو اسے

مغرب کی طرف سے درپیش تھے۔ ان خطرات میں وطنیت کا وہ محدود اور تنگ و تاریک تصور بھی تھا جو خالصتاً مغربی اذہان کی پیداوار تھا اور اسلامی نظام فکر اور طرز زندگی میں جس کی قطعی کوئی گنجائش نہ تھی وہ وطن سے محبت کے قائل تھے، تاہم وہ اس نعرے کے خلاف تھے جس کی بدولت ایک مختصر سی مدت میں دنیا نے دو عالمی جنگیں دیکھیں نیشنلزم کی تحریک ہمیں انسان دوستی کا سبق نہیں دیتی اس تحریک نے نہ صرف انسان کو انسان سے جدا کیا بلکہ اسلامی تعلیمات کی سراسر نفی کی اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے یہ سبق پڑھایا کہ تمام انسان، خواہ وہ کسی رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں، برابر ہیں اقبال کی دوربین نظروں نے یہ دیکھ لیا کہ مغرب وطن پرستی کا ڈھونگ رچا کر دنیا کو مذہب سے بیگانہ کر کے اور اس طرح ان کی قوت کو پارہ پارہ کر کے مذموم مقاصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے اسی لیے انہوں نے عالم اسلام کو تلقین کی۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی

علامہ اقبال شاعر مشرق بھی ہیں اور شاعر اسلام بھی ساتھ ہی ساتھ وہ ہمارے قومی شاعر بھی ہیں لیکن اگر ہم ان کی شاعری کے پیام کی آفاقی نوعیت پر ذرا بھی غور کریں اور شاعر کے مقصد اور رویے کی وسعت اور جذبات اور احساسات کی گہرائی پر نظر ڈالیں تو اقبال کو شاعر انسانیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا وہ بنی نوع انسان کے شاعر ہیں اور تمام نوع بشر کو اخوت و محبت کے رشتے میں باندھ کر ایک بہتر اور بلند زندگی اور ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کی طرف لے جانا چاہتے ہیں

5 ''کلیات اقبال اردو'' (بانگ درا) ص 280

سچ بات تو یہ ہے کہ ان کو سب سے زیادہ فکر انسان کے مستقبل کا ہے

اقبال نے ہمیں ایک با اختیار اور آزاد انسان کا تصور دیا۔۔۔۔ ایسا انسان جو مسخر کائنات بھی ہے یہ نوع انسانی کے لیے ان کا ایک اہم عطیہ ہے اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ انسانی زندگی کے لامحدود امکانات کے مبلغ بھی ہیں ان کے تمام فکر کا نصب العین تکمیل آدمیت ہے دنیا کے ہر **ملک** کا باسی ان کا مخاطب ہے وہ فرد میں خود اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ اپنی استعداد اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی شخصیت کو بھرپور بنا سکے۔

اقبال کے کلام کو پڑھ کر قاری اپنے اندر ایک نیا ولولہ حیات اور اپنے ذہن میں ایک نئی روشنی محسوس کرتا ہے:

ہر اک قام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

تو رہ نورد شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول!
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

علامہ اقبال نے ایک ماہر اور فیاض حکیم کی طرح ان اسباب کو بھی سمجھا جو مغرب کے زیر اثر عالم اسلام کے بدن میں زہر گھول رہے تھے اور فساد فکر و نظر پیدا کرنے کا ذریعہ تھے مغرب کی تمام تر ترقی مشاہدہ اور تجربات سے اخذ شدہ نتائج پر مبنی تھی یوں نوجوانوں کے دماغ تو روشن ہوئے مگر ان کے دل تیرہ و تاریک ہو کر رہ

گئے۔

اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں نئی نسل کو مخاطب کر کے جو نصیحت کی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ دانش کی دو قسمیں ہیں۔۔۔ایک دانش نورانی اور دوسری دانش برہانی دانش برہانی سے بجز حیرت و تشنگی کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا ہمیں فلسفیوں کے نکتہ دقیق پر ایمان و یقین کو ترجیح دینی چاہیے اور قلب کی گہرائیوں سے خالق بزرگ و برتر کی

6 ایضاً (''بال جبریل'') ص 47

7 ایضاً (''ضرب کلیم'') ص 72

عظمت اور محمد عربی کی رسالت کا اقرار کرنا چاہیے آدمی اپنی بندگی اور عبودیت کا رشتہ اسی ذات برحق سے جوڑے اور تمام عالم سے بے نیاز ہو جائے جس طرح توحید جب قلب کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے تو عشق پیدا ہوتا ہے جو سراپا یقین اور سراپا حضور ہے آتش عشق قلب کی ظلمتوں کو نور سے بدل دیتی ہے موت جیسی شے اب اس کا محبوب قرار پاتی ہے، اور جس کے دل میں موت کی محبت سرایت کر جائے اس میں دنیا کے مال و جاہ کی محبت کیسے غالب آ سکتی ہے اور یوں بندہ میں ''فقر'' پیدا ہو جاتا ہے۔

علامہ نے جن خطرات کو محسوس کیا تھا، دنیائے اسلام کو آج بھی ان کا سامنا ہے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت علامہ کی تعلیمات کی روشنی میں عہد جدید کے امراض کو پہچانیں اور ان کا علاج بھی دریافت کریں آج عالم اسلام ایک اضطراب سے دوچار ہے یہ بے چینی ایک نئی زندگی کی علامت ہے مگر اس وقت صحیح سمت کا

تعین ازبس ضروری ہے اگر ہمارے دلوں میں ایمان اور یقین کی لو بلند ہو تو راستے کے مصائب جو بظاہر پہاڑ کی طرح دکھائی دیتے ہیں پر کاہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

☆☆☆☆☆

اقبال کا اسلامی ریاست کا تصور*

جسٹس کریم اللہ درانی

میں نے ''اقبال کا اسلامی ریاست کا تصور'' بطور موضوع اس لیے منتخب کیا ہے کہ پاکستانی اپنی حیات ملی کے سی سالہ دور میں خواہش وتمنا کے باوصف اپنی حیات ملی کا اسلوب متعین نہیں کر سکا۔ اگرچہ اس کے قیام سے بہت پہلے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے عزم کیا تھا کہ ایسا خطہ ارضی حاصل کریں کہ اس میں آباد مسلمانوں کو جو وہاں ایک قطعی اکثریت ہوں گے اپنی قومی و ملی زندگی کے خدوخال اپنی مذہبی امنگوں اور دینی تقاضوں کے مطابق ابھارنے کا موقعہ حاصل ہو اور وہ بالآخر ایک ایسی دینی ریاست کے قیام کے قابل ہو جائیں جو ان کے عقیدے اور روحانی رجحان سے مطابقت رکھتی ہو، اور شاید اسی خواہش و ارادے نے ہمیشہ اس سیلاب کے آگے بند کا کام کیا ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس مملکت کو کسی اور راہ پر ڈالنے کے لیے کبھی کبھار اُمڈتا رہا ہے اس ملک میں ویسٹ منسٹر قسم کی جمہوریت کی جڑیں قائم نہ ہو سکنے کا ایک باعث بھی اغلباً یہی مخفی جذبہ رہا ہے اس امر سے قطع نظر کہ اس سلسلے میں کوئی قدم راست سمت کی جانب اب تک اٹھا ہے یا نہیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملت پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے سے اس کے عناصر ترکیبی نے جو منزل اور مقصد اپنے لیے متعین کیا تھا اس کی تلاش میں اس کی روح مسلسل بھٹک رہی ہے اور اغلباً یہاں دستوری و جمہوری

اداروں کے عدم استحکام کا ایک سبب یہی تشنگی اور احساس محرومی بھی ہے اور آج جب

*21 اپریل 1980 کو منعقدہ یوم اقبال کے موقعہ پر پڑھا گیا

ایک بار پھر، عملاً نہ سہی قولاً ہی، ہم ایک ایسی نظریاتی مملکت کی تعمیر و تشکیل کے لیے کمر بستہ ہونے کا اظہار کر رہے ہیں حضرت علامہ اقبالؒ، جن کی دور بینی اور اصابت نظر و فکر کا خود پاکستان اپنے قیام کے لیے مرہون منت ہے، کے افکار کی روشنی میں اسلامی ریاست کے متعلق ان کا تصور اجاگر کرنا وقت کی ضرورت بن گیا ہے۔

حضرت علامہ کے پیغام کی آفاقیت مسلمہ ہے یہ کسی خاص ملک سے متعلق نہیں ہے اور نہ ان کا پیغام کسی خاص زمانے سے تعلق رکھتا ہے ان کی شاعری آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہے جس طرح تخلیق کے وقت تھی، اور زمانہ نصف صدی گزر جانے پر بھی اس کی افادیت میں کوئی کمی پیدا نہیں کر سکا اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس پیغام کی ہمہ گیری افلاک و ماہتاب کی گردش کے ساتھ اسی طرح جاری و ساری رہے گی، جب تک یہ گردشیں زمانے میں جاری ہیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت علامہ اول و آخر مسلمان تھے ان کے لیے قرآن پاک ہی تمام رشد و ہدایت کا سر چشمہ ہے اور رسول اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہی مظہر تکمیل انسانیت ہے اور آپ کا لایا ہوا دین ہی زمانے کے دکھ کا مداوا اور انسانیت کی تمام تشنگیوں کے لیے آب حیواں ہے۔

اقبال اسلام کے پیغام میں مادی اور روحانی حدود میں کوئی امتیاز نہیں پاتے ان

کے نزدیک ''دنیائے مردار'' ایسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی آپ مادی اور روحانی اقدار کے باہمی امتیاز وامتزاج کے متعلق اپنے مشہور خطبات مدراس کے چھٹے خطبے میں جو The Principle of movement in the Structure of Islam کے عنوان سے دیا گیا تھا فرماتے ہیں:

'' In Islam the spiritual and the temporal are not two distinct domains, and the nature of an act, however secular in its import,''

علامہ اقبال Reconstruction of religious thought in islam ص 154

Is determined by the attitude of mind with which the agent does it. it is the invisible mental background of the act which ultimately determins its chracter. an act is temporal or profane if it is done in a spirit of detachment from the ifinite complexity of life behind it it is spiritual if it is inspired by thar complexity

ترجمہ اس کا یوں ہوگا:

'' اسلام میں روحانیت اور مادیت دو الگ الگ اور ایک دوسرے سے غیر متعلق دائرے نہیں ہیں اور ہر فعل جس قدر مادی کیوں نہ ہو، اس کی اصل وہ ذہنی

کیفیت ہے جس کے تحت وہ فاعل سے ظہور پذیر ہوتا ہے یہ نظر نہ آنے والا ذہنی پس منظر ہی ہے جس سے ہر فعل کی بالآخر نوعیت متعین ہوتی ہے ہر وہ فعل مادی اور غیر مستحسن ہے جس کا محرک زندگی کے لامحدود تقاضوں اور سنجیدگیوں اور پیچیدگیوں سے فرار ہو اور ہر وہ فعل روحانی ہے جو ان تقاضوں یا پیچیدگیوں سے حرکت پذیر ہو۔''

اس مسئلے کی مزید وضاحت یوں فرماتے ہیں:

''The ultimate reality, according to the quran, is spiritual and its life consists in its temporal activity. the spirit finds its opportunities in the natural, the material, the secular. all that is secular is, therefore, sacred in the roots of its being.''

یعنی، حقیقت نامہ قرآن کی رو سے روحانی ہی ہے جو مادی عمل سے زندگی پاتی ہے روحانیت اپنے مواقع فطرت، مادیت اور غیر روحانیت میں حاصل کرتی ہے اس لیے ہر لادینی فعل اپنی اصل سے تقدس حاصل کر لیتا ہے۔

اقبال کے نزدیک ریاست محض انسانی جمعیت میں روحانیت کے استوار کے حصول کی ایک جہد ہے فرماتے ہیں:

''the essence of tauhid as a working idea, is equality, solidarity, and freedom. the state,

from the islamic standpoint, is an endavour to transform these ideal principles in to space-time forces an apiration to realize them "in a definite human organization

2 ایضاً ،ص 155   3 ایضاً ،ص 154

یہ بات اردو میں یوں ہوگی یہ رمز لا الہ یعنی توحید کی روح کو جو ایک عملی تصور کے طور پر مساوات، حریت اور اخوت ہے زمانی و مکانی قوتوں میں اظہار کی ایک سعی ہے یہ ان روحانی اقدار کے ایک انسانی تنظیم میں حصول کی خواہش کی تعبیر ہے۔

اقبال کے نزدیک سلطان کے لیے ظل اللہ اور ظل سبحانی ہونے کا تصور جو ایک مفروضہ ہے، ریاست کے مزاج کے دینی ہونے سے اخذ نہیں ہوتا اور نہ اس تصور سے ریاست دینی مزاج حاصل کرتی ہے فرماتے ہیں:

"It is in this sence alone that the state in Islam is a theocracy, not in the sense that it is haded by a respresintativ e of god on earth who can always screen his despotic will behind "his supposed infallibilty

یعنی صرف انہی معانی میں اسلام میں ریاست دینی ہے، نہ کہ اس بنا پر کہ اس کا سربراہ اللہ تعالیٰ کا کرہ ارض پر نمائندہ ہوتا ہے جو ہمیشہ اپنے آمرانہ افعال کے لیے

معصومیت کے مفروضہ پردوں میں پناہ لیتا ہے۔

اب چونکہ اسلامی ریاست کے بنیادی تصورات، حریت، مساوات اور استحکام، توحید کے نظریے سے حاصل ہوتے ہیں، اس لیے یہ ارتقائے عالم انسانی کے غیر محدود امکانات کے حامل ہوتے ہیں اور اس ضمن میں رنگ، نسل اور جغرافیہ کی تمام حدود کو پائمال کر کے تمام انسانیت کو اللہ کا کنبہ بنا دیتے ہیں بمصداق حدیث شریف ''الخلق عیال اللہ'' کہ اس طرح مسلم معاشرے کے تمام افراد پر لازم ہے کہ وہ اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل سے عقیدہ توحید کے تحت ان تصوراتی حقیقتوں کو تمام عالم انسانی میں اس وقت تک جاری و ساری رکھنے کی سعی کرتے رہیں جب تک تمام عالم ان نظریات کو اپنا نہیں لیتا۔

صدا نوا داری چو خوں در تن رواں
خیز و مضرابے بہ تار او رساں
زآنکہ در تکبیر راز بود تست
حفظ و نشر لا الہ مقصود تست

4 ایضاً، ص 155

تا نہ خیزد بانگ حق از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

اور پھر اس سبق کی تکرار یوں کرتے ہیں

می ندائی آیہ ام الکتاب
امت عادل ترا آمد خطاب

''کنتم خیر امۃ اخرجت للناس'' (تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے لیے نکالے گئے) اور ''ولا یجر منکم شنان وقوم علی الا تعدلوا عدلو من ھو اقرب للتقوی'' (اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس طرف نہ لے جائے کہ انصاف نہ کرو انصاف کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے)

آب و تاب چہرہ ایام تو
در جہاں شاہد علی الاقوام تو

نکتہ سنجاں را صلائے عام دہ
از علوم امیے پیغام دہ

ان نظریات کو اپنانے کا ہی ایک منطقی نتیجہ تھا کہ جب اسلامی ریاست کے ایک صوبے مصر میں وہاں کے عامل حضرت عمرو بن العاصؓ کے لڑکے نے مفتوح قوم قبطی کے ایک ذمی فرد کو بے قصور چانٹا مار دیا تو مرکز خلافت نے اس ذمی کی دادرسی میں تمام جاہ حکومت اور سیاسی حکمت عملی کے مفروضہ تقاضوں کو نظر انداز کر کے اسے چانٹے کا قصاص دلوایا اور اس قصاص دلوانے میں حضرت عمر فاروقؓ کی زبان پر ،تاریخی جملہ آیا جو زمانے نے محفوظ کر لیا کہ '' آدمی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوتا ہے تم نے آزاد کو غلام کیسے سمجھ لیا؟''

یہ رمز توحید سے وجود میں آنے والی ریاست اپنے ہر شہری کو وہ مقام بخشتی ہے جو بحیثیت ایک مرد حر کے بلا امتیاز عہدہ و مرتبہ اسے باقی تمام افراد معاشرہ کے اس طرح ہم سر او رمثیل بنا دیتا ہے کہ ایک عام مسلمان کا وعدہ تمام ریاست کے لیے

ایک مقدس امانت بن جاتا ہے اس دعوے کی دلیل میں حضرت علامہ ''رموز بے خودی'' میں سالارِ لشکر عجم جابان کے ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھوں میں گرفتار ہونے اور

5 ''کلیات اقبال فارسی'' (''رموز بے خودی'') ص139

6 ایضاً 7 ایضاً

اپنی شخصیت کو اخفا میں رکھتے ہوئے جان کی امان اس لشکری سے حاصل کر لینے کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ جب اس کی اصل شخصیت ظاہر ہوگئی کہ سب سے بڑا دشمن اسلام اور کسریٰ کی طاقت کا ستون تھا اور اہل لشکر نے اس کے قتل کا علے الرغم مذکورہ امان مطالبہ کیا تو امیر لشکر امین الامۃ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی زبان سے یہ اصول بیان فرماتے ہیں:

گفت اے یاراں مسلمانیم ما
تار چنگیم و یک آہنگیم ما
نعرہ حیدر نسوائے بوذرؓ است
گرچہ از حلق بلالؓ و قنبرؓ است
ہر یکے از ما امین ملت است
صلح و کینش، صلح و کین ملت است
ملت ار گردد اساس جان فرد
عہد ملت می شود پیمان فرد
گرچہ جاباں دشمن ما بودہ است

مسلمے او را اماں بخشودہ است
خون او اے معشر خیر الانام
بر دم تیغ مسلماناں حرام

اور یہ فرد کا پیمان ریاست کے لیے مقدس اور ملت کے لیے اس کا اپنا اجتماعی عہد اس لیے بن جاتا ہے کہ:

فرد و قوم آئینہ یک دیگرانہ
ملک و گوہر، کہکشان و اختر اند
فرد می گیرد زملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد اور ملت کا یہ ارتباط ہی اسلامی ریاست کی اصل قوت اور عظمت ہوتا ہے اور ملت کی حیات کا کمال یہ ہے کہ ملت فرد کی طرح احساس خودی پیدا کرے اور اس احساس کی تولید و تکمیل ضبط و روایات ملی سے ممکن ہوتی ہے اقبال کے نزدیک حیات ملی تسخیر قوائے نظام عالم ہے

---

8 ایضاً ، ص 106 9 ایضاً ، ص 84

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

اور

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرہ تعمیر کردار

اس تسخیر قوائے نظام عالم کے نتیجے میں ملت اپنے لیے جہان تازہ تعمیر کرتی ہے جو جہان اس کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے، جہاں ظلم واستبداد کا وجود نہیں ہوتا، جو جبر واستحصال سے نا آشنا اور انسانیت کے شرف وعظمت کا آئینہ دار رہوتا ہے اس جہاں میں فرد کی ذات میں ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ مہ وستارہ اس کے حلقہ کمند میں محصور ہو جاتے ہیں

غایتش توسیع ذات مسلم است

امتحان ممکنات مسلم است

اور جس طرح ہر ریاست کے لیے ضبط ونظم آئین مہیا کرتا ہے اسلامی ریاست بھی اپنا آئین رکھتی ہے، اور جس ملت کے ہاتھ سے اس کا آئین نکل جاتا ہے وہ خاک کے ذروں کی مانند بکھر کر اپنی ہستی کھو دیتی ہے

ملتے را رفت چوں آئیں زدست

مثل خاک اجزائے او ازہم شکست

مسلم معاشرہ بھی اپنی سیاسی ہستی اور بقا کے لیے آئین کا محتاج ہے

ہستی مسلم ز آئین امت و بس

باطن دین نبیؐ ایں است و بس

کہ نظم ہستی آئین سے عبارت ہے

برگ گل شد چوں ز آئیں بستہ شد

گل ز آئیں بستہ شد گلدستہ شد

---

10 ایضاً،ص 142 11 ایضاً،ص 141

12 ایضاً، ص 142 13 ایضاً، ص 121

14 ایضاً 15 ایضاً

اسلامی ریاست کو یہ آئین میسر ہے قرآن سے

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

نسخہ اسرار تکوین حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

اور

نوع انساں را پیام آخریں
حامل او رحمۃ اللعالمین

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور قرآن کیا ہے؟

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغام مرگ
دستگیر بندہ بے ساز و برگ!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

اور جب اسلامی ریاست کا دستور و آئین قرآن سے شکل پذیر ہوتا ہے اور اسی پیام آخریں سے جو نوع انسانی کو دیا گیا سیاست کے تصورات اخذ کرتا ہے تو اس ریاست میں میر وفقیر، راعی ورعایا اور حاکم ومحکوم کے درمیان تفریق مراتب نہیں ہوتی اور توحید الٰہی سے مستنبط، مساوات، اخوت وحریت کا لازمی نتیجہ اس یک رنگی اور ہم آہنگی میں ظاہر ہوتا ہے کہ:

پیش قرآں بندہ و مالا یکے است
بوریا و مسند دیبا یکے است

اور ایک معمار کی ظلماً دست تراشی سلطان مراد کا ہاتھ قصاص میں کاٹ دینے کا حکم ریاست کے قاضی سے صادر کرا دیتی ہے کیونکہ

عبد مسلم کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگیں تر از معمار نیست

16 ایضاً 17 ایضاً ص 123-122

18 ایضاً (''جاوید نامہ'') ص 229-228

19 ایضاً (''رموز بے خودی'') ص 108

20 ایضاً

پادشاہت کا تقدس، سلطان کا ظل الٰہی ہونے کا تخیلے، خانوادہ شاہی کے نیلگوں خون (Blue blood) کا تصور سب پاش پاش ہیں کہ سروری در دین ما

خدمت گری است سید القوم خادمھم

یہ ریاست جو اپنے وجود کا تانا بانا قرآن کے مہیا کردہ عناصر سے بنتی ہے اپنے امور کی سرانجامی باہمی مشاورت پر استوار کرتی ہے ''وامرھم شوریٰ بینھم'' (ان کے معاملات باہمی مشورہ سے سرانجام پاتے ہیں) اور ''وشاورھم فی الامر'' فاذا عزمت فتوکل علے اللہ، ان اللہ یحب المتوکلین (اور اے نبیؐ! اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیجئے کام میں اور پھر قصد ہو جائے (بات طے پا جائے) تو پھر بھروسا کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل کرنے والوں سے) لیکن یہ باہمی مشاورت اقبال کے نزدیک عصر حاضر کی معروف طرز جمہوری نہیں ہے جو افراد کو تعداد کے جبر کا شکار بناتی ہے اور ایک گروہ کی مرضی و منشا کو محض کثرت تعداد کے بل بوتے پر کم تعداد والوں پر جاری و نافذ کر کے ان کی خودی کو پائمال کر دیتی ہے اور انسانوں کے ایک گروہ کی دوسرے گروہ کے ہاتھوں آزادی و حریت کی نعمتوں سے محرومی میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ محض افراد کا شمار معاشرے کی فلاح کا باعث نہیں بن سکتا اس لیے اکثر دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب رہتا ہے

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صر خر فکر انسانے نمی آید

اس لیے محض شمار افراد سے پیدا ہونے والی ہیئت سیاسیہ کو اقبال اسلامی ریاست کی اساس کار بنانے کے قائل نہیں ہیں کہ اس سے انسان پر انسان کا جبر تو پیدا ہوتا ہے اجتماعی خودی کی نشوونما کی تکمیل ممکن نہیں رہتی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال ایک طرف شاہی، آمریت اور جاگیرداری

کے دشمن ہیں اور فرد کی خودی اور اس سے پیدا ہونے والی عظمت کے قائل ہیں اور دوسری طرف عصری تصور جمہوریت کو اساس

21 ایضاً (''پیامِ مشرق'') ص 190

22 ایضاً، ص 205

ریاست اسلامی بنانے کے روادار بھی نہیں ہیں اور قرآن کو آئین حفظ ملت ٹھہراتے ہیں تو کیا اس سے ان کی مراد وقدامت پرستی ہے کہ ریاست اسلامی صرف ان معنوں میں دینی ہے کہ اس پر ان عناصر کی اجارہ داری رہے جن کی ستم شعاری سے وہ خود مدت العمر نالاں رہے اور جس میں سے ایک گروہ کی کوتاہ فہمی وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یا جس کے متعلق اس کا یہ فتویٰ ہے ملا فی سبیل اللہ فساد یا اس دوسرے عنصر کو اس کی تقدیر کا مالک بناتے ہیں جس کے فلسفے کو وہ ہمیشہ فلسفہ بزی کہتے رہے اور جس خانقہی تصوف کے مسکرات کے اثرات سے مسلمان کو بچانے کے لیے تلخ نوائی پر مجبور ہوئے؟ اور کیا اقبال آزاد مسلم معاشرے کو محض ماضی کے افکار و رسوم کے تنگ دائرے میں محصور رکھنا چاہتے ہیں؟ وہ تو اس کے قائل ہیں کہ ''جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی!''

اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال ملی تقاضوں، عصری ضروریات اور ملت کے اسلوب حیات کو کسی طور اور کسی طرح قرآن پاک کی بنیادی حقیقتوں سے متصادم

نہیں پاتے انہیں اسلام میں کہیں بھی جمود کا سراغ نہیں ملتا جو سکوت مرگ اور فکری انجماد انہیں مسلم معاشروں میں نظر آتا ہے وہ ان کے نزدیک ایسی قید یا تحدید کا نتیجہ نہیں ہے جو دین نے عائد کی ہو یا پیدا کی ہو، بلکہ یہ ان معاشروں کے افراد کی دوں ہمتی کا نتیجہ ہے ورنہ اقبال کے نزدیک اسلام وہ زندہ و تابندہ دستور حیات ہے جو سکون و جمود سے نا آشنا اور انسانی فکر و شعور کی تمام ارتقائی منزلوں میں اس کا ساتھ دیتا ہے اسی لیے اسلام کے وجود میں اقبال کو حرکت کے تصور کی نفی نہیں ملتی اسی لیے وہ الٰہیات کی تشکیل جدید

---

23 ''کلیات اقبال اردو'' (''ضرب کلیم'') ص 498

24 ''کلیات اقبال فارسی'' (''جاوید نامہ'') ص 224

25 ''کلیاب اقبال اردو'' (''بانگ درا'') ص 259

کے نقیب ہیں اور اسلام میں حرکی تصور پیش کرتے ہیں اور خواہاں ہیں کہ مرور زمانہ کی بدولت پیدا ہونے والے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی وہ سعی و کوشش ایک بار پھر جاری ہونی چاہیے جو تیسری صدی ہجری کی علمی کاوشوں سے فقہ اسلامی کی تدوین کی صورت میں نمایاں ہوئی دوسرے معنوں میں اقبال اجتہاد کی روح کے مسلم ریاست میں قائم و دائم رہنے کے قائل ہیں، مگر وہ اجتہاد کا حق ہر کہ و مہ یا کسی سیاسی ہیئت یا مقننہ قسم کے اداروں کو دینے کے روادار بھی نہیں ہیں انہیں علم ہے کہ اس زمانے میں انتخاب کے ذریعے یا دوسرے ذرائع سے جو ہیئت حاکمہ اور ہیئت مقننہ وجود میں آتی ہے اس کے ارکان کی اکثریت اسلام کی روح سے نا آشنا اور دین کے بنیادی تقاضوں سے ناواقف ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ادارے فقہ

اسلامی کی تدوین جدید، جو لازماً اپنی بنیادی ضرورت کے طور پر اجتہاد کی متقاضی ہے، کے اہل نہیں ہیں، اس ضمن میں اقبال نے ایران کے 1906 کے آئین میں ایرانی مقننہ یا مجلس میں علما کی نمائندگی اور انہیں قانون سازی پر نگران حیثیت حاصل ہونے کا دوسرے مذاہب فکر رکھنے والے اسلامی معاشروں سے تقابلی جائزہ لیا ہے اور ایران کے مخصوص طرز فکر میں کہ علما غیبت امام میں امام غائب کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے مناسب حال تصور فرماتے ہوئے باقی عالم اسلام کے لیے یکساں ممکن العمل اس لیے نہیں پایا کہ دوسرے مذاہب فکر میں علما کو وہ مقام تقدس حاصل نہیں ہے۔

وہ اس کا ایک حل یہ بتاتے ہیں کہ مسلم ریاست کی پارلیمنٹوں میں ایسے اصحاب کی انتخاب یا کسی اور ذریعے سے موثر نمائندگی ہونی چاہیے جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے عمرانی مسائل سے آشنا اور علوم جدید سے بھی اتنے ہی آگاہ ہوں جتنی وسعت نظر انہیں علوم دینیہ میں حاصل ہو اور اس قسم کے طبقہ فکر کے میسر آنے کے لیے سامان ایسے اداروں میں پاتے ہیں جہاں اسلامی اصول فقہ کی تدریس میں ایسی وسعت مہیا ہو جو عصری مروجہ غیر اسلامی قانون و اصول قانون کے مطالعے کا موقعہ بھی بہم پہنچاتی ہو۔

اقبال اسلامی ریاست کے وجود کو الہیات کی تشکیل جدید کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے قدم قدروں اور اداروں کا معدوم ہونا بھی گوارہ نہیں کرتے اور بالکل بجا طور پر ماضی سے یک قلم رشتہ قطع کر دینے کے حق میں نہیں ہیں جو تجربا تا ترک کی اصلاحی تحریک میں ملت ترکیہ نے کیا، وہ اس سے متفق نہیں ہیں

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

وہ اس ضمن میں یہ تنبیہہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں

No people can afford to reject their past entrely for it is their past that has made their personal identity and in a society like islam the problem of a revision of old instituions becomes still more delicate, and the responsibility of the reformer assumes a far more serious aspect. islam is non territorial in its chracter and its aim is to furnish a model for the final combination of humanity by drawing its adhents from a variety of mutually repellent races, and then transforming this atomic aggregate in to a people possessing a self consciousness of their own

اردو میں یہ کلیہ اس طرح بیان ہو سکتا ہے ''کوئی قوم اپنے ماضی سے مطلقاً رشتہ منقطع نہیں کر سکتی یہ اس کا ماضی ہی ہوتا ہے جس سے اس کا تشخص قائم ہے اسلام کی طرح کے معاشروں میں تو قدیم اداروں کی تشکیل جدید نہایت نازک مسئلہ ہوتی

ہے اور مصلح کی اس بارے میں ذمہ داری بڑی عظیم اور نازک اور ہم رخ اختیار کر لیتی ہے اسلام اپنے مزاج میں علاقائی نہیں ہے اس کا مقصد وحید تو یہ ہے کہ تمام انسانیت کے اشتراک کے لیے ایسا نمونہ قائم اور پیش کرے جس میں مختلف نسل اور باہمی متحارب معاشروں سے اس کے پیروکار افراد کھنچ کر ایک نقطے پر جمع ہو جائیں ار یہ اجتماع ایک ایسی جمعیت میں ڈھل جائے جو اپنے مخصوص مزاج کی خود آگاہی سے پوری طرح سرشار ہو۔''

آج اس کلیے کی صداقت جدید ترکیہ اور ایران کے فکری اور سیاسی رجانات نے کس قدر وضاحت سے ثابت کر دی ہے۔

---

27 ایضاً (''ضرب کلیم'') ص 20

---

28 علامہ اقبال، Reconstruction، ص 127

☆☆☆☆☆

مطالعہ اقبال کے چند نئے زاویے*

عبدالسلام خورشید

حضرت علامہ اقبال نے شعر و شاعری، دین، فلسفے اور سیاست کے دوائر میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں، لیکن ان کے علمی عزائم کا کوئی انت نہیں تھا مختلف موضوعات پر نثر میں بہت سی کتابیں لکھنا چاہتے تھے لیکن وہ سکون میسر نہیں تھا جو علمی کاموں کا ایک لازمہ ہے اور جب قوت لایموت کا مسئلہ ہوا اور فرصت کے لمحے بھی مل گئے تو علالت حائل ہوگئی اور یوں ان کے عزائم پورے نہ ہو سکے۔

حضرت علامہ کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ Reconstruction of islamic jurisprudence کے نام سے ایک کتاب لکھیں جس میں زمانہ حال کے اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں اور دلائل و براہین سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے اب سے نصف صدی پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین سے خطاب کرتے ہوئے کہا "میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں ہر روز تلاوت کرتا ہوں مگر ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدید اس مطمع حیات سے کس

طرح ترقی کرتے ہوئے بنی ہے جو قرآن شریف نے

---

*علامہ اقبال کے ایک سو تیسرے یوم پیدائش کی منعقدہ تقریب (9 نومبر 1980) کے موقعہ پر پڑھا گیا

ظاہر کیا ہے اس کے دو سال بعد 1931 میں ''بمبئی کرانیکل'' کے نامہ نگار سے انٹرویو کے دوران میں Thought in Islam Reconstruction of religious کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس میں میں نے جدید علوم کی روشنی میں اسلام کے مذہبی فلسفے کا تجزیہ کیا ہے میرا ارادہ یہ ہے کہ اسی انداز میں فقہ پر کام کروں کیونکہ اس پہلو کو ہمارے علما نے صدیوں سے نظر انداز کر رکھا ہے 1935ء میں آپ نے راس مسعود کے نام مکتوب میں امید ظاہر کی: ''میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ جدید تفکر کی روشنی میں قرآن حکیم پر وہ یادداشتیں قلم بند کروں جن کے بارے میں میں مدت سے سوچ رہا ہوں میرے نزدیک دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے میرا یہ بہترین تحفہ ہوگا'' اسی سال ''سٹیٹسمین'' میں ایک مکتوب بنام مدیر کے دوران میں لکھا ''میں نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں اسلام سے مجوسیت کی گرد اتارنے کی کوشش کی تھی اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی اگلی کتاب Aids to the study of the quran میں اس سلسلے میں مزید کام کر سکوں گا''

سوال یہ ہے کہ علامہ نے Introduction to the study of islam کی یادداشتوں کا جو خاکہ جناب محمد شفیع (م ش) کے حوالے کیا تھا وہ مندرجہ بالا منصوبے سے تعلق رکھتا تھا یا اس سے مختلف کوئی منصوبہ تھا ممکن ہے صرف

موضوع کے الفاظ کا فرق ہو اور اس سے ایک ہی کتاب مراد ہو، لیکن جو خاکہ م ش کے حوالے کیا گیا اس کا متن غور سے پڑھیے کہ یہ دو لیکچروں کا خاکہ تھا، اور چونکہ جس زمانے کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ یہ خاکہ اس دور میں مرتب کیا گیا ہو جب اقبال صحت مند تھے ایک لیکچر کا موضوع ہے ''اسلام کیا ہے؟'' اس میں مختلف مذاہب کے ساتھ تقابل کے بعد اسلام کی برتری کا ذکر ہے، کلیسیا اور ریاست کا تعلق واضح کیا گیا ہے اور آخر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلام عیسائیت کا نہ دشمن ہے نہ حریف، بلکہ تہذیب کے عمل میں اس کا رفیق کار ہے دوسرے لیکچر کا عنوان ہے ''اسلام کا قانون'' اس کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور دوسرے امور کے علاوہ شعوب و قبائل کے خاتمے معاشی مساوات، مملکت اور مذہب، اسلام اور سرمایہ داری، اسلام اور عورت، نجات کا مفہوم اور ایمان کے موضوعات شامل ہیں نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو مختلف تحریکیں اٹھیں ان کا بھی تجزیہ مقصود تھا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خاکہ علامہ کی مجوزہ کتاب ''تشکیل فقہ جدید'' ہی سے تعلق رکھتا ہو۔

علامہ کا یہ ارادہ بھی تھا کہ خود نوشت سوانح مرتب کریں اس ارادے کا ذکر مختلف مکتوبات میں ملتا ہے سید سلیمان ندوی کو لکھا ''اپنے دل و دماغ کی سرگزشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا'' اگلے مہینے عشرت رحمانی کو لکھا ''میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لیے

سبق آموز ہو سکے۔ہاں خیالات کا تدریجی انقلاب البتہ سبق آموز ہو سکتا ہے اگر کبھی فرصت ہوگئی،تو لکھوں گا فی الحال اس کا وجود عزائم کی فہرست میں ہے'' اس کے دو سال بعد بدایوں کے رسالہ ''نقیب'' کے مدیر وحید احمد کے نام لکھا ''حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا یہ ایک طویل داستان ہے کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین ہے بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا''

عزائم کی فہرست میں کچھ اور چیزیں بھی شامل تھیں،مثلاً علامہ تصوف اسلامیہ کی ایک جامع تاریخ لکھنا چاہتے تھے تا کہ ''معاملہ صاف ہو جائے اور غیر اسلامی عناصر کی تقطیع ہو جائے''عنفوان شباب میں یہ ارادہ تھا کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کریں کہ ملٹن کی Paradise Regained کا جواب ہو جائے۔ 1925 میں اس عزم کا اظہار کیا کہ Islam as I Understand it کے نام سے ایک کتاب لکھیں ایک دفعہ یہ خیال بھی آیا کہ نٹشے کی کتاب ''زرتشت نے یوں کہا'' کی طرح بعض مابعد الطبیعی اور طبیعی حقائق و معارف بائبل کے طرز پر لکھے جائیں ان سب پر مستزاد علامہ کا یہ ارادہ تھا کہ ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کے سلسلے کی تیری کڑی لکھی جائے اس سلسلے میں مولانا گرامی کے نام ایک خط میں لکھا ''مثنوی کا دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے،مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں اس حصے کا مضمون ہوگا حیات مستقبلہ، اسلامیہ، یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی ا ندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے اور

جماعت اسلامیہ، جس کی تاسیس دعوت ابراہیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصد و غایت کیا ہے میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف اور واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے میں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں بہر حال میں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اس کی اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی یا جب اس کا وقت آئے گا اشاعت ہو جائے گی۔''

☆☆☆☆☆

علامہ اقبال کی دو نظموں کی سرگزشت*

محمد عبداللہ قریشی

آپ نے ''بانگ درا'' میں علامہ اقبال کا یہ مشہور قطعہ ''عید پر شعر لکھنے کی فرمائش کے جواب میں'' کئی بار پڑھا ہوگا یہ دراصل مسلمانوں کے زوال کا ایک پر درد مرثیہ ہے جو لاہور کے مشہور تاریخی باغ ''شالامار'' کے ایک ''برگ زرد'' کی زبانی بیان کیا گیا ہے اس ''برگ زرد'' کو حضرت علامہ نے ''موسم گل کا رازدار'' کہا ہے نظم میں ہمارے شاندار ماضی کے تذکرے کے ساتھ گزشتہ تہذیب و تمدن کی وہ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں جو اب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو چکی ہیں ایک ایک لفظ میں جہان معنی پنہاں ہے مصرعے مصرعے پر مضمون لکھا جا سکتا ہے، مثلاً:

کیا وہ موسم گل جس کا راز دار ہوں میں
اجاڑ ہو گئے عہد کہن کے میخانے

خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یاد فصل بہار
خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں!

پیام عشق و مسرت ہمیں سناتا ہے!
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے!

اقبال نے یہ اشعار کب اور کس کی فرمائش پر لکھے؟ یہ سوالات

*9 نومبر 1980 کو علامہ کے ایک سو تیسرے یوم پیدائش کے موقع پر پڑھا گیا

ہر پڑھنے والے کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ان کا جواب شاید دل چسپی سے خالی نہ ہو دل چسپ اس لیے بھی کہ اقبال فرمائشوں پر بہت کم توجہ دیتے تھے وہ شخص کس قدر خوش نصیب ہوگا جو اقبال کو گرم سوز و ساز کر سکا اور جس کی تحریک پر اقبال نے یہ دل دوز قطعہ لکھا۔

کراچی نے انگریزی روزنامہ ''ڈان'' نے 1950 میں اس اخبار کا اردو ایڈیشن شائع کرنے کا تجربہ بھی کیا تھا، جس کی ادارت الطاف حسین، سید حسن ریاض اور فضل احمد صدیقی کے سپرد تھی اس کی 22 اپریل 1950 کی اشاعت میں جناب بدر الحسن صاحب اختر بدایونی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ علامہ اقبال نے یہ نظم بدایوں کے مولوی نظام الدین حسین، مدیر ہفتہ وار ''ذوالقرنین'' کی فرمائش پر لکھی تھی، اپنی تاریخ دانی کا ثبوت یوں دیا تھا:

''یہ اسی سرزمین کے ایک ادیب اور صحافی کی فرمائش کی تکمیل ہے جس کے لیے علامہ نے ایک جگہ کہا ہے''

اے خاک بدایونے، ترسم کہ دگر خیزد
آشوب ہلا کوئے ہنگامہ چنگیزے

بدایوں کی اہمیت جتانے کے جوش میں انہوں نے تحریف و تصرف سے کام

لے کر علامہ کے اس مصرع ہی کو بدل ڈالا ''از خاک سمرقندے ترسم کہ دگر خیزد'' اور آشوب ہلاکو اور فتنہ چنگیز بھی سمرقند کے بجائے بدایوں ہی سے اٹھا دیے بہر حال میں نے اس تحقیق کو آگے بڑھایا اور مولوی نظام الدین حسین نظامی مرحوم کے پوتے جمال الدین مواس سے 21 اگست 1915 کے ''ذوالقرنین'' کا وہ پرچہ حاصل کر لیا جس میں اس نظم کی شان نزول کی پوری کیفیت دی گئی ہے واقعہ یہ ہے کہ مولوی نظامی نے اگست 1915 میں عید الفطر کی تقریب سعید پر بدایوں میں اپنی شان اور نوعیت کا ایک انوکھا مشاعرہ منعقد کیا یہ ایک قسم کا عید ملن جشن تھا جس میں روحانی غذا کے ساتھ ساتھ کام و دہن کی ضیافت کا اہتمام بھی کیا گیا تھا مشاعرے کے لیے یہ طرح تجویز کی گئی تھی

اے دل پر داغ بے تابی سے کچھ حاصل نہیں

مقامی شاعروں کے علاوہ باہر سے بھی چند بزرگ شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا، جن میں سے لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال نے اپنی بعض مجبوریوں کا عذر کر کے مشاعرے میں شرکت تو نہ کی لیکن اپنی نظمیں ڈاک کے ذریعے بھیج دیں، جو خاص عید کے موضوع پر مولوی نظامی کی فرمائش کے جواب میں تھیں یہ دونوں نظمیں 14 اگست کے مشاعرے میں جو سید محفوظ علی بدایونی کی صدارت میں ہوا تھا، پڑھوانے کے بعد جشن عید کی پوری روداد کے ساتھ 21 اگست 1915 کے ''ذوالقرنین'' میں شائع کر دی گئیں اس بات کو آج پینسٹھ برس ہوتے ہیں مشاعرے کی تمام غزلیں اور نظمیں پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اظہار و بیان کے اسلوب اور پیرایے مختلف ہونے کے باوجود جذبات سب

کے ایک سے تھے یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا ترکیہ اور دیگر اسلامی ریاستوں پر آگ کے شعلے برس رہے تھے مسلمان جہاں کہیں بھی تھے اپنے اپنے دینی بھائیوں کی تباہی و بربادی کی لرزہ خیز داستانیں سن سن کر خون کے آنسو رو رہے تھے اکبر الہ آبادی تو یہ کہہ رہے تھے۔

پیش نظر ہمارے ہے شام شب فراق
اس کی سحر جو ہو تو ہماری بھی عید ہے

اقبال بھی سوگوار تھے ان کی یہ نظم انہی جذبات کی آئینہ دار ہے

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے!
ہلال عید ہماری ہنسی اڑتا ہے

جب یہ قطعہ اخبار ''ذوالقرنین'' میں شائع ہوا تھا تو اس کے آٹھ شعر تھے ''بانگ درا'' کی ترتیب کے وقت اس کے دو شعر حذف کر دیے گئے، جس سے فرمائش کرنے والے کا نام نکل گیا اور نظم کا عنوان ایک معما بن کر رہ گیا دیکھیے نظامی صاحب کو مخاطب کر کے اقبال کس دل سوزی سے اپنے غم واندوہ اور تنہائی کا اظہار کرتے ہیں

مجھے قسم ہے نظامی! مدینے والے کی
ہمیشہ ماتم ملت میں اشک بار ہوں میں

سرود مرغ نوا ریز و ہم نشینی گل
مرے نصیب کہاں غنچہ مزار ہوں میں

علامہ اقبال کی یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ انہی دنوں اس پر تضمینوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا بدایوں ہی کے ایک شاعر کی تضمین کے یہ دو بند بطور نمونہ پیش خدمت ہیں

وہ دین جس سے کہ بزم جہاں کی رونق تھی
ہزار حیف کہ مردہ ہوا ہے جیتے جی!
شریک غم نہ ہوں یہ ہے خلاف ہمدردی
''مجھے قسم ہے نظامی! مدینے والے کی
ہمیشہ ماتم ملت میں اشک بار ہوں میں''

وہ غم پسند ہے دل، غم سے چین پاتا ہے
خوشی کی باتوں سے منہ کو کلیجہ آتا ہے
یہ لطف دید ملاقات دل دکھاتا ہے
''پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے''

دوسرا قطعہ ''وحی'' کے زیر عنوان ''ضرب کلیم'' میں ہے اس کے شان نزول کی کیفیت یہ ہے کہ سر سید احمد خان کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے بیٹے سر راس مسعود علی گڑھ یونیورسٹی کی وائس چانسلری سے مستعفی ہونے کے بعد نواب حمید اللہ خاں، فرماں روائے ریاست بھوپال، کے اصرار پر ناظم اعلیٰ تعلیمات وامور مذہبی کی حیثیت سے بھوپال میں مقیم تھے وہ 1934ء سے جولائی 1937ء تک یعنی

اپنی وفات تک وہیں رہے علامہ اقبال کی ذات سے ان کی اور نواب صاحب بھوپال کی والہانہ عقیدت اقبال کو اکثر بھوپال آنے کی دعوت دیتی رہتی تھی اقبال نے ''ضرب کلیم'' نواب صاحب کی خدمت میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کی:

بگیر ایں ہمہ سرمایہ بہار از من

کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

اس تعلق خاطر کی بنا پر اقبال اپنے گلے کی بیماری کے برقی علاج کے لیے اکثر بھوپال جاتے اور سر راس مسعود کے ہاں کئی کئی دن مہمان رہتے مسعود کے پاس قیام کے دوران میں اقبال پر اکثر بلند پایہ فکر اور خیال کا الہام ہوتا ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی (مرحوم) صدر شعبہ مذہب و ثقافت، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، بیان فرماتے تھے کہ ''ایک مرتبہ لاہور جاتے ہوئے میں راس مسعود سے ملنے کے لیے بھوپال اتر گیا اتفاق سے اقبال بھی مسعود ہی کے مکان پر فروکش تھے، لیکن بیماری کا ان پر غلبہ تھا تقریباً فریش تھے معراج کی شب تھی مسعود کا مدار المہام امور مذہبی کی حیثیت سے مسجد شاہ جہانی میں منعقد تقریب میں شریک ہونا شاید ضروری تھا۔ تقریب معراج میں جاتے ہوئے مسعود نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔''

''منبر پر فروکش ایک مولانا وعظ فرما رہے تھے انہوں نے وحی اور نبوت کے اسرار جس عالمانہ انداز میں پیش کیے اور جس دردیدہ ذہنی کے ساتھ اس موقعہ پر اقبال کے کلام سے استناد کیا، راس مسعود کو اس جہل و جرأت نے بہت دکھ پہنچایا وہ ان مہملات کو سننے کی تاب نہ لا سکے زیادہ دیر تک وہاں نہ ٹھہرے اور جلد ہی لوٹ آئے۔''

''گھر پہنچے تو اقبال جاگ رہے تھے اور قلبی دورے کی وجہ سے کسی قدر بے چین تھے مسعود مزاج پرسی کے لیے اقبال کے کمرے میں چلے گئے اور ان کا دل بہلانے کی خاطر نہایت ہی دلچسپ اور شیریں انداز میں مولانا کی اس ہرزہ سرائی کا ذکر کیا، جس سے وہ خود تو پر دل ہوئے تھے لیکن اقبال کو خوش دل کر دیا۔ مسعود کی سحر بیانی، خوش کلامی، ادیبانہ انداز گفتگو، فطری ظرافت اور خوش طبعی اقبال کے لیے ہزاروں دواؤں کی ایک دوا ہوا کرتی تھی اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے مسعود کی گفتگو نے تریاق کا کام کیا ہے یک بارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہوئے اقبال کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی اور انہوں نے بڑے ہی ظریف لیکن متین انداز میں کہا'' اگر مولانا نے میرے کلام کو اپنے حسب منشا استعمال کیا ہے، تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ اس موقعے پر اقبال نے امام غزالی کا ایک واقعہ بیان کیا فرمایا کہ طویل سفر کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد غزالی دمشق پہنچے جمعہ کا دن تھا جمعہ پڑھنے کے لیے جامع امویہ کا قصد کیا مسجد بھری

---

1 ''اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی'' ص 55

ہوئی تھی سیڑھیوں کے قریب جوتیوں کے پاس جگہ پائی صفیں چیر کر آگے بڑھنے کے بجائے درویشانہ انداز میں وہیں بیٹھ گئے نماز کے بعد ایک واعظ نے اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھانے شروع کیے ایک موقع پر اپنے کسی قول کی تائید میں اس نے امام غزالی کا نام استعمال کیا غزالی چونکہ بہت حیران ہوئے اور انہوں نے اپنی نیک نفسی سے واعظ کے متعلق بدگمان ہونے کے بجائے یہ خیال کیا کہ کسی غلط روایت پر اعتماد کر کے ان کی جانب یہ قول منسوب کر دیا ہے۔''

''آدابِ فقر و درویشی نے امام غزالی کو فوراً وعظ کی اس غلطی کی تصحیح کی اجازت نہ دی مگر جب وعظ ختم ہو گیا اور مجمع چھٹ چکا، تو انتہائی تواضع اور انکسار کے ساتھ آگے بڑھے اور واعظ سے تخلیے میں کچھ کہنے کی درخواست کی غزالی عمر میں واعظ کے باپ ہو سکتے تھے مگر واعظ نے ان کو بچہ کہہ کر مخاطب کیا اور کہا'' میاں! ہم سے تخلیہ کیا؟ جو چاہو کہہ دو، غزالی نے جب واعظ کو اس غلط انتساب پر متنبہ کیا، تو وہ ایک دم طیش میں آ گئے کہا: '' کچھ دماغ میں خلل تو نہیں ہوا ہے کہ خود کو غزالی سمجھنے لگا ارے! تیرے باپ نے تیرا نام اگر غزالی رکھ دیا ہے، تو کیا تو امام غزالی ہو گیا؟ امام غزالی اس کا جواب تو کیا دیتے، صبر کیا اور خاموشی کے ساتھ لوٹ آئے۔''

''یہ واقعہ سنانے کے بعد اقبال نے مسکراتے ہوئے فرمایا اگر میں ان مولانا سے یہ کہتا کہ میرا یہ منشا ہرگز نہیں تھا، جس کا اظہار آپ فرما رہے ہیں، تو شاید غزالی سے کچھ بہتر سلوک میرے ساتھ نہ کیا جاتا۔''

''مسعود سے تھوڑی سی گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال بالکل تندرست ہو چکے ہیں، لیکن مسعود نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور ان کو آرام کی نیند سونے کے لیے خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔''

اقبال کے لیے ملاجی کی اس ہرزہ سرائی نے مہمیز کا کام کیا اور ایک بہترین الہام کا سامان مہیا کر دیا۔ ڈاکٹر ظہیر فرماتے ہیں: ''صبح جب ہم اقبال کے ساتھ چائے پی رہے تھے، تو اقبال نے کہا کہ رات ''حقیقت وحی'' کے متعلق بے ساختہ ایک خیال نظم ہو گیا ہے مسعود، جن کے لیے اقبال کا ہر لفظ الہام کا درجہ رکھتا تھا، اس لئے الہام کے سننے کے لیے سراپا اشتیاق اور مجسم گوش دکھائی دینے لگے اقبال نے

حسب معمول اپنے پرتمکین اور باوقار لہجے میں فرمایا''

عقل بے مسایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن تخمیں تو زبوں کار حیات!
فکر بے نور ترا، جذب عمل بے بنیاد!
سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شب تار حیات!
خوب و نا خوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر
گر حیات آپ نہ ہو شارح اسرار حیات

ڈاکٹر ظہیر فرماتے ہیں کہ ''حقیقت وحی'' کے متعلق اس اظہار خیال کو اور خود اقبال کی زبانی سن کر ایک عجیب وجد اور سرشاری کی کیفیت تھی جو صرف محسوس ہی کی جا سکتی تھی، الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی مسعود تو تقریباً جھوم رہے تھے اور مزے لے لے کر اس قطعے کو دہرا رہے تھے اس نادر تخیل نے وحی کے متعلق تمام پردے ہٹا دیے اجنبیت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت دور کر کے یہ محسوس کرا دیا کہ وحی باہر سے مسلط کیا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ خود انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے پیغمبر کا ضمیر انسانیت کے لیے مجلا اور شفاف آئینے کا کام دیتا ہے اس میں ہر فرد انسانی کے ضمیر اور زندگی کی فطری احتیاجات کا انعکاس ہوتا ہے پیاسی فطرت کی آبیاری کے لیے اس کے ضمیر کی گہرائیوں سے علم و عرفان کے چشمے ابل پڑتے ہیں جو پوری انسانیت کے ضمیر کی نمائندگی کرتے ہیں۔

وحی کی یہ کتنی جاذب توجہ، معقول اور دل نشیں تعبیر ہے کہ ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے زندگی خود کو گونا گوں پیچیدگیوں، نت نئے ہنگاموں اور گھٹا ٹوپ

تاریکیوں میں مبتلا کر لیتی ہے انسانی عقل، جو حواس کے تابع ہے اور صرف ظن و تخمین اور شک وشبہ کا فائدہ دے

2 ''کلیات اقبال اردو'' (''ضرب کلیم'') ص500

سکتی ہے اور عمل کے حسن و قبح کے لیے کوئی آخری، قطعی اور یقینی معیار نہیں پیش کر سکتی جب خود کو ان گتھیوں کے سلجھانے سے قاصر پاتی ہے، تو بلا استعانت حواس اپنے اسرار آپ کھولتی اور خوب و ناخوب عمل کی گرہ کشائی کے لیے آخری، قطعی اور یقینی راہ اختیار کر لیتی ہے حل مشکلات کے اسی طریقے کو اقبال وحی کہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:

''اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے گویا اسلام کی پیدائش اخذ نتائج کی قابلیت کی پیدائش ہے اسلام میں نبوت اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی اس لیے وحی نے خود اپنے خاتمے کی ضرورت محسوس کی یہ بات اس اہم حقیقت کا پتا دیتی ہے کہ قدرت کاملہ نے انسان کو مکمل شعور حاصل کرنے کے لیے اپنی ذاتی قابلیتوں پر ہی بھروسا کرنے کے لیے مجبور کیا ہے قرآن مجید کا پیشوائیت اور بادشاہیت کو ختم کرنا اور عقل و تجربے پر زیادہ زور دینا بھی اسی منشائے ایزدی کے اشارے ہیں۔''

یوں دیکھا جائے تو شریعت، جس کا سرچشمہ وحی ہے، انسان پر تھپا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ اعماق حیات سے نکلے ہوئے احکام کا مجموعہ ہے، جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا ہے

فاش می خواہی اگر اسرار دیں
جز با عماق ضمیر خود مبیں

گویا:

حقیقت را بہ رندے فاش کردند

کہ ملا کم شناسد راز دیں را

---

3 ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' ص 120 (اردو ترجمہ صفحات 193-194)

---

4 ''کلیات اقبال فارسی''(''پس چہ باید کرد'')ص 826

☆☆☆☆☆
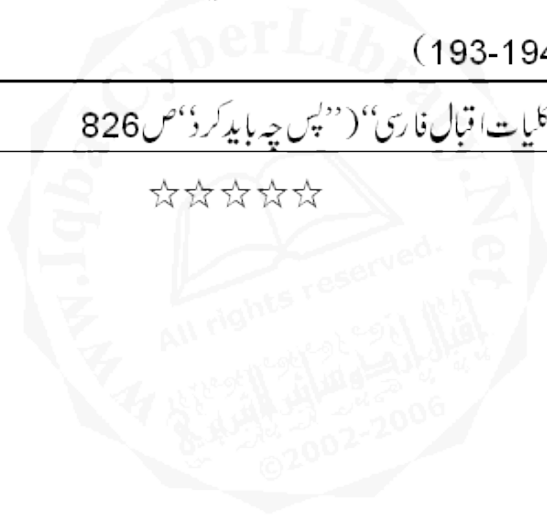
علامہ اقبال اور پشتون*

محمد نواز طائر

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

پشتون سرزمین روہ کے باسی جو افغان اور پٹھان کے نام سے تاریخ میں عرصہ دراز سے پہچانے جاتے ہیں اپنی فطری خصوصیات کی بنا پر غیور اور جسور بھی ہیں اور سخت کوش بھی غالباً اپنے جغرافیائی محل وقوع نے تاریخ کے ہر دور میں ان کو زندہ رہنے کے وہ گر سکھائے ہیں جو ایک زندہ و پائندہ ملت کے لیے از حد ضروری ہوتے ہیں پشتون ملت یا ملت افاغنہ نے جو ہمیشہ سے قبائل میں منقسم رہی ہے اپنی قبائلی روایات کو اس لیے سینے سے لگائے رکھا کہ ان میں ان کی شرافت وحمیت اور نجابت و پاکیزگی کا راز پوشیدہ ہے۔ قبیلے کی شان، خاندان کی عظمت اور فرد کے ذاتی کردار کو ہمیشہ اس ملت نے ایک دوسرے کے ساتھ منسلک رکھا ہے ان تقاضوں کے پیش نظر پشتون قبائل نے اپنے لیے ''پشتو'' کے نام سے ایک ضابطہ اخلاق مرتب کیا ہے جو انسان کی تمام اعلیٰ صفات اور خوبیوں کا مظہر بھی ہے اور ان کا احاطہ بھی کرتا ہے یہی پشتونوں کی انفرادی، قبائلی اور اجتماعی کردار کی کسوٹی ہے اسی بنیاد پر پشتون اپنے معاشرے اور قبائل میں افراد کی جانچ پرکھ کرتے ہیں اور اسی بنا پر ان کے لیے وہ آئیڈیل بنتا ہے جسے پشتون ننگیال یا مرد حر کہتے ہیں یہ شخص چاہے اپنے

گھرانے میں ہو، چاہے خاندان، خیل یا قبیلے میں،

---

*علامہ اقبال کے ایک سو تیسرے یوم پیدائش پر منعقدہ تقریب (9 نومبر 1980 کے موقعہ پر پڑھا گیا

---

1 ''کلیات اقبال اردو'' (''بال جبریل'') ص 446

قبائل کی آنکھوں کا تارا ہوتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو بقول علامہ:

ملت آوارہ کوہ و دمن

در رگ او خون شیراں موجزن

زیرک و روئیں تن و روشن جبیں

چشم او چوں جرہ بازاں تیز بیں

مگر اس کے باوجود بھی

قسمت خود از جہاں نا یافتہ

کوکب تقدیر او نا تافتہ

چونکہ پشتونوں کی عام تربیت ایسے ماحول میں ہوتی ہے جہاں فرد میں اس قسم کی صفات از خود پیدا ہو جاتی ہیں اس لیے جو شخص ان صفات میں زیادہ ممیز اور اکمل ہو وہی پشتونوں کی نظر میں حقیقتاً صاحب کردار کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور وہی صاحب دستار ہونے کا بھی حق دار ہوتا ہے اگرچہ پشتونوں کی یہ روایت ان کا قومی خاصہ ہے لیکن اگر کوئی اس بات پر غور کرے تو بنیادی طور پر یہی اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ ہے یعنی ''ان اکرمکم عند اللہ اتقکم'' (قرآن مجید 13:49)

فرد کے کردار میں ہر دل عزیزی تب پیدا ہوتی ہے کہ وہ ہمہ صفت موصوف ہو''
چہ کلی بہ نامہ لری یو خوئی لا نو روخہ لری'' شہر جس کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں وہ
اوروں سے کسی نہ کسی خوبی میں افضل اور فائق ہوتا ہے لیکن پشتون معاشرے میں
چونکہ افراد اپنے گردو پیش یا خاندان، خیل اور قبیلے میں ایک دوسرے پر فوقیت اور
سبقت حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں اس لیے بسا اوقات ان کی مثبت پشتو اپنا
اصلی رنگ کھو کر اس کی جگہ منفی پشتو یعنی ''تربورولی'' اور اس قسم کی دوسری قباحتیں پیدا
کر دیتی ہیں حالانکہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ پشتو اعلیٰ ترین صفات و کردار کا نام ہے
لیکن دوسری طرف وہ پشتو کی اس بگڑی ہوئی شکل کو بھی اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں
اس کشمکش وہ پیکار نے ہمیشہ سے پشتونوں کو خانگی چپقلشوں اور جدال و قتال میں
مصروف رکھا ہے اگر چہ پشتون کا اصل جوہر پشتونولی میں مضمر ہے

---

2 ''کلیات اقبال فارسی'' (''پیام مشرق'') ص 188

---

3 ایضاً

لیکن باہمی رقابتوں نے ہمیشہ اس جوہر کو ناکارہ اور زنگ آلود رکھا

امتاں اندر اخوت گرم خیز

اور برادر با برادر دو ستیز

شاعر مشرق علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کی فراست اور دور بین نگاہی نے
پشتونوں کے اس جوہر حقیقی کو دیکھ لیا تھا اور اپنی شاعری میں، چاہے وہ اردو زبان
میں ہے یا فارسی میں، انہوں نے ''مرد حر'' اور فطرت کے مقاصد کا نگہبان ہونے کی
صفات جن لوگوں میں دیکھیں ان میں مرد صحرائی اقوا عرب تھیں اور مرد کہستانی

پشتون قبائل جو جدا جدا قبیلوں اور خیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور جنہیں علامہ ''ملت آوارہ کوہ و دمن'' کہہ کر پکارتے ہیں اقبال اپنی تمام زندگی میں مرد مومن کی تلاش میں رہے اور ان کے مرد مومن کے لیے آزاد فضاؤں اور اعلیٰ کردار و صفات کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا تھا وہی معیار اگر چہ عام طور پر اس زمانے میں مسلمانان عالم میں ظاہری طور پر مفقود دکھائی دیتا تھا لیکن حضرت علامہ یکسر نا امید نہ ہوئے تھے وہ جانتے تھے کہ مغرب کی جو ہوا چلی ہے اگر چہ اس نے عالم اسلام کو بے تحاشا نقصان پہنچایا ہے اور ملت اسلامیہ جو انحطاط اور نا امیدی کی فضا سے دو چار ہے، اس میں ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جن میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور جو فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کی اہلیت بھی رکھتے ہیں:

وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردک میدانی

کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی!

علامہ نے اپنے کلام میں اکثر موقعوں پر یا تو پشتونوں کو براہ راست خطاب فرمایا ہے یا پھر شیر شاہ سوری، خوشحال خان خٹک، احمد شاہ ابدالی، سید جمال الدین افغانی، غازی امان اللہ خاں محمد نادر شاہ اور محمد ظاہر شاہ وغیرہ کے حوالے سے اور یا غلام قادر روہیلہ اور محراب گل افغان کی صورت میں ان سے خطاب کیا ہے اس کے علاوہ ان کی ایک ہم مثنوی ''مسافر'' بھی اس موضوع پر لکھی گئی ہے یہ کتاب علامہ کے سفر افغانستان کی سرگزشت ہے شاعر مشرق نے شاہ افغانستان کی دعوت پر 1933ء میں ''سرزمین بے آئین'' کا سفر کیا تھا اس سفر میں آپ پشاور سے ہو کر کابل، غزنی اور قندھار گئے۔

علامہ اقبال کے کلام کے وہ حصے جو ''ضرب کلیم''، ''جاوید نامہ''، ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' وغیرہ میں ہم پڑھتے آئے ہیں ان کا ذکر تو اکثر ہوتا رہا ہے لیکن مثنوی ''مسافر'' جو اس موضوع پر علامہ کے کلام کا اہم ترین حصہ ہے اکثر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے مثنوی ''مسافر'' کے آغاز میں جب حضرت علامہ اٹک کے اس پار کا ذکر چھیڑتے ہیں اور جب ان کی نگاہ سرزمین روہ کے پہاڑوں اور اس میں بسنے والے قبائل پر پڑتی ہے تو نوجوان افغان شہزادے محمد ظاہر شاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

سوختیم از گرمی آواز تو

اے خوشا آں قومے کہ دا اند راز تو

از غم تو ملت ما آشناست

مے شناسیم ایں نواہا از کجاست

اے بہ آغوش سحاب ما چو برق

روشن و تابندہ از نور تو شرق

یک زماں در کوہسار ما درخش

عشق را باز آں تب و تابے بہ بخش

تا کجا در بندہا باشی اسیر

تو کلیمی راہ سینائے بگیر!

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ جس طرح ''جاوید نامہ'' میں جاوید کو برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی نوجوان نسل کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اسی

طرح مثنوی ''مسافر'' میں محمد ظاہر شاہ ملت افاغنہ کی نوجوان نسل کا نمائندہ قرار دیا گیا ہے۔

خیبر کی سرزمین سے گزرتے ہوئے علامہ کی شناسائی جب ان افغان قبائل سے ہوتی ہے جن کے آباؤ اجداد صدیوں سے درہ خیبر اور اس کے دونوں جانب تبواہ و شلمان کے کوہساروں میں مقیم رہے ہیں اور جنہوں نے ہر دور میں اپنی آزادی اور حریت کو قائم رکھا ہے تو اس سرزمین اور اس کے مکینوں کے بارے میں علامہ جو تاثر قائم کرتے ہیں اس سے علامہ کی پشتونوں سے بے پناہ محبت اور ان پر غیر متزلزل اعتماد کا بھی پتا چلتا ہے فرماتے ہیں:

---

2 ''کلیات اقبال فارسی'' (''مسافر'') ص 852

خیبر از مردان حق بیگانہ نیست
در دل او صد ہزار افسانہ ایست!

سبزہ در دامان کہسارش مجوے
از ضمیرش برنتاید رنگ و بوے
سر زمینے کبک او شاہیں مزاج
آہوے او گیرد از شیراں خراج!
در فزایش جرہ بازاں تیز چنگ
لرزہ برتن از نہیب شاں پلنگ!
لیکن از بے مرکزہ آشفتہ روز

بے نظام و ناتمام و نیم سوز!

فر بازاں نیست در پرواز شاں

از تدرواں پست تر پرواز شاں!

آہ قومے بے تب و تاب حیات

روزگارش چوں صلوت بے امام!

ریز ریز از سنگ او مینائے او

آہ! از امروز بے فردائے او!

یہ تاثر کیونکر پیدا ہوا؟ اس لیے کہ علامہ کو جس ملت میں زندگی کی حرارت اور تڑپ نظر آتی تھی وہی ملت ان کو آوارہ اور بغیر رہ بر و راہ نما کے گم کردہ راہ نظر آئی انہیں یہ قبائل یوں دکھائی دیے گویا بے امام نمازیوں میں کوئی سجدے میں ہو، کوئی قیام اور قعود میں ہو حالانکہ ان کی منزل اور مطمح نظر ایک ہی ہے۔

قوموں میں جب راہ نمائی کرنے والوں کا فقدان ہو جائے تو ان کی حالت بلا شبہ ایسی ہی ہو جاتی ہے، چاہے ان کے پاس کوئی نظریہ، کوئی منزل مقصود یا کوئی تصور حیات کیوں نہ موجود ہو۔ اس تصور حیات، اس نظریے اور اس منزل مقصود پر سب کو یک جا کرنے کے لیے کسی قومی رہ بر اور فعال راہ نما اور میر کارواں کی ضرورت ہوتی ہے اس زمانے میں جب علامہ درہ خیبر سے گزر رہے تھے تو ان کو اگرچہ پشتونوں میں حریت و آزادی کی فطری صفات صاف دکھائی دے رہی تھیں اور ان کو یہ بھی علم تھا کہ اپنے دین اور عقیدے کے ساتھ ان کا کس قدر لگاؤ ہے، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ بیرونی حاکموں سے کیونکر برسر پیکار ہیں اور وہ یہ بھی

جانتے تھے کہ یہ غیور قبائل عالم اسلام کے لیے اپنے سینوں میں کتنا بے پناہ درد رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کو اس کا علم بھی تھا کہ یہ لوگ اپنے کسی رہبر اور راہ نما کے بغیر کس حال میں ہیں

---

7 ایضاً، ص 852-853

اس لیے تو وہ پکار اٹھے

آن یکے اندر سجود، ایں در قیام
کاروبارش چوں صلوت بے امام!

اور پھر چلتے چلتے اقوام سرحد سے خطاب فرمایا

اے زخود پوشیدہ خود را بازیاب
در مسلمانی حرام است ایں حجاب!
رمز دین مصطفی دانی کہ چیست
فاش دیدن خویش را شاہنشہی است!
چیست دیں؟ دریافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش
آن مسلمانے کہ بیند خویش را
از جہانے بر گزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست
تیغ لا موجود الا اللہ اوست

اور پھر سرحد کے پشتونوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں (تم نے اپنی یہ کیا

حالت بنا رکھی ہے؟) تم جو کہ ایک زندہ قوم ہو اور مشیت نے تمہیں ایک اعلیٰ اور ارفع مقصد کے لیے پیدا کیا ہے تم کیوں نہ اس مقصد کے لیے ہمہ تن مصروف عمل ہوئے؟ تم اپنی غفلت شعاری کو کیوں نہیں محسوس کرتے اور اپنی اس زبوں حالی سے خود کو نکالنے کے لیے جدوجہد میں کیوں تامل کرتے رہے ہو؟ فرماتے ہیں:

در جہاں آوارہ بے چارہ
وحدتے گم کردہ صد پارہ
بند غیر اللہ اندر پائے تست
داغم از داغے کہ در سیائے تست

پھر پشتونوں کو وحدت ملی اور اتحاد قومی کا درس دیتے ہیں اور اس اعلیٰ و ارفع مقصد کی خاطر جس میں سارے مسلمانان عالم کے وجود اور ارتقا کا راز پنہاں ہے اور جو علامہ کے لیے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل رہا ہے اور جسے وہ ہر کہیں پیدا کرنے کے متمنی اور آرزومند تھے اسے وہ سب سے پہلے پشتونوں میں دیکھنا چاہتے تھے وہ حضرت مولانا جلال الدین بلخیؒ کی ایک نصیحت ملت افاغنہ کو یاد دلاتے ہیں اور فرماتے ہیں

رزق از حق جو، مجو از زید و عمر
مستی از حق جو، مجو از بنگ و خمر

---

8 ایضاً، ص 854 9 ایضاً ص 855

گل مخر، گل را مخور گل را مجو
زآنکہ گل خوار است دائم زرد رو

دل بجو تا جاوداں باشی جواں
از تجلی چہرہ ات چوں ارغواں
بندہ باش و بر زمیں رو چوں سمند
چوں جنازہ نے کہ بر گردن برند!

یہی مرد کی زندگی کا راز ہے اور اس میں وہی قوت پنہاں ہے جو انسان کو فطرت کے سر بستہ رازوں کو آشکارا کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے اور اسے ان مخفی طاقتوں کو اپنی اور انسانیت کی فلاح کے لیے کام میں لانے کی قوت اور استعداد مہیا کرتا ہے یہی قوت جب مجتمع ہو کر وحدت ملی میں آشکارا ہو جائے تو اس سے وہ قوت عالم وجود میں آتی ہے جو حیات بخش، حیات آفرین اور حیات جاوداں کا سبب بنتی ہے اور اس کے افراد پھر امامت اور رہبری کے حق دار بھی ہو جاتے ہیں عالم انسانیت کے لیے ان کا وجود خدا کی رحمت اور ذریعہ برکت بن جاتا ہے۔

علامہ ملت افاغنہ کے ہر فرد سے اسی کردار کا نمائندہ بننے کی توقع رکھتے ہیں اور ان سے پر زور درخواست کرتے ہیں:

پور آزر کعبہ را تعمیر کرد
از نگاہے خاک را اکسیر کرد
تو خودی اندر بدن تعمیر کن
مشت خاک خویش را اکسیر کن

پشتونوں کی پشتو حقیقت میں انہی اعلیٰ صفات و اقدار کا آئینہ ہے
یہی وہ جوہر حقیقی ہے جو اس مرد کوہستان کے مرد مومن ہونے کی دلیل اور

پہچان ہے اقبال پشتونوں کے اس جوہر حقیقی کی نشوونما کے متمنی تھے اور اسے مزید جلا دینے کے آرزومند تھے، اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ:

کڑکا سکندر بجلی کی مانند

تجھ کو خبر ہے اے مرگ ناگاہ!

نادر نے لوٹی دلی کی دولت

اک ضرب شمشیر! افسانہ کوتاہ!

افغان باقی، کہسار باقی!

الحکم للہ! الملک للہ!

---

10 ایضاً

11 ایضاً852

---

12 ''کلیات اقبال اردو'' (''ضرب کلیم'') ص268

دوسری جنگ عظیم کے بعد وقت کے دھارے نے اس سرزمین کے مکینوں کو ایک عجیب انداز سے اپنی لپیٹ میں لے لیا آہنسا، زر پرستی اور اشتراکیت نے نہ جانے خیبر اور ماورائے خیبر کیا کیا گل کھلائے ہیں با ایں ہمہ اب بھی خیبر کے باسیوں میں مردان حق پرست کی کمی نہیں اور حال کے واقعات نے تو یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ لوگ اب بھی ان توقعات پر پورے اتر سکتے ہیں جو علامہ اقبال کی نظر میں مقاصد فطرت کی تکمیل کے لیے ان سے وابستہ ہیں ان پر آشوب حالات میں اپنے اسلاف کی روح جلیلہ کے وارث اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں جو اقبال کے نزدیک حق بینی، حق گوئی اور حق جوئی کی مظہر ہیں اور ایک بار پھر دنیا پر یہ حقیقت ثابت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ:

خیبر از مردان حق بیگانہ نیست
در دل او صد ہزار افسانہ ایست

سبزہ در دامان کہسارش مجوے
از ضمیرش برفتابد رنگ و بوے

سر زمینے کبک او شاہیں مزاج
آہوے او گیر داز شیراں خراج

در فضایش جرہ بازاں تیز جنگ
لرزہ برتن از نہیب شاں پلنگ!

☆☆☆☆☆

اقبال اور بلوچستان*

عطا شاد

اقبال ایک ہمہ جہت اور ہمہ جو شاعر ہیں انہوں نے بڑے دل نشین اور فکر انگیز لہجے میں زندگی کے رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھایا ہے انہوں نے بڑی دل نواز لے میں انسان کے منصب، اس کے تشخص اور اس کی عظمت کے نغمے گائے ہیں انہوں نے بڑے حکیمانہ انداز میں اسرار کتاب بیان کر کے پیغام خداوندی کی اصل روح کو اجاگر کیا ہے وہ حیات و کائنات کے شاعر ہیں، لیکن ان کے فکر و فن کے ان پہلوؤں کا ادراک مجھے بہت عرصہ بعد ہوا ایک عمر کی کاوش کے بعد مجھے ان سے شناسائی ہوئی، محض شناسائی جو حقا معرفتک کی منزل پر شاید کبھی نہ پہنچ پائے۔ البتہ اقبال کو بلوچستان کے شاعر کی حیثیت سے میں نے اسی وقت پہچان لیا تھا جب میں اپنے شعری ذوق کی ابتدائی منزلوں سے گزر رہا تھا اس وقت شاید میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ بلوچستان کی زندگی اور یہاں کے جذبہ و احساس، یہاں کے بندہ صحرائی، یہاں کے مرد کہستانی کی بات کرنے والا یہ شاعر بلوچی زبان میں کیوں بات نہیں کرتا۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد!

یا

کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشاد شرق و غرب

تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

---

*21 اپریل 1981 کو منعقدہ یوم اقبال کے موقعہ پر پڑھا گیا

---

1 ''کلیات اقبال اردو'' (''بال جبریل'') ص 300

---

2 ایضاً ص 321

یا

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو

نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا!

یہ اور ایسے بے شمار دوسرے اشعار بلا شبہ جہد حیات اور مسلسل تگ و تاز کے بارے میں اقبال کے آفاقی پیغام کا حصہ ہیں، لیکن مجھے ہمیشہ ان میں بلوچستان کا دل دھڑکتا سنائی دیتا ہے مجھے ان سے چلتن کے یخ بستہ تختہ بہ تختہ سلوں کے چٹخنے کی صدا آتی ہے۔

آپ جانتے ہیں بلوچستان لق و دق صحراؤں اور بنجر پہاڑوں کی سرزمین ہے، اس خطہ وطن میں آج بھی ایسی بے شمار وادیاں ہیں جو اونچے پہاڑوں کے قدرتی حصار میں محصور ہیں اور جہاں انسانی ارتقا کی جھلمل کرتی مشعلوں کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچی فطرت نے ارض وطن کے اس خطے کو ایسی منفرد خصوصیات بخش دی ہیں کہ سخت کوشی زندگی کا لازمہ بن گئی ہے اور جب یہ سخت کوشی کی زندگی مجھے اقبال کے اشعار میں اپنی بھرپور رعنائی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے تو زمان و مکان کی ساری حدیں مٹ جاتی ہیں۔

مجھے 1712 کے ایک مشہور شاعر بالاچ کی ایک نظم کے ایک بند کا اردو ترجمہ سنانے دیجئے۔

کوہ	بلوچوں	کے	قلعے	ہیں
بلند	چوٹیاں	ان	کی	بادگیر	ہیں
زمین	ان	کو	بچھونا	
اور	پتھر	ان	کے	سرہانے	ہیں
بیٹے	ان	کی	کمانوں	کے	تیر	ہیں
بھائی	ان	کے	بندوقوں	کے	کارتوس	ہیں
داماد	ان	کے	بے	نیام	خنجر	ہیں

یا

یہ جو آسمان پر پرندے قطار اندر قطار دکھائی دیتے ہیں دراصل

---

3 ایضاً ص 324

بالاچ کی کمان سے چھوڑے ہوئے تیر ہیں۔

اقبال مجھے اس طرح کوہ چلتن کی کسی بلند و بالا چوٹی سے بلوچستان کے حدی خواں کے روپ میں دکھائی دینے لگتے ہیں علامہ اقبال ان عقابی روحوں کو جس رنگ، جس انگ، جس عکس، جس لمس، جس نقطے اور جس زاویے سے بیان کرتے ہیں وہ بولان کی وادی میں موسم موسم سفر کرنے والے بوڑھے ساربان سے لے کر اس نوزائیدہ بچے تک کے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے جو چادر میں لپٹی ہوئی بوڑھی ماں کے کندھے سے لگے سفر گزیدگی کے عالم میں سانس لے رہا ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے! بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر!
گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیابان میں
کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کار آشیاں بندی!

بہت سے لوگوں نے یہ شعر محض پڑھا ہوگا، دیکھا نہیں ہوگا میں نے اسے عملی زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت کے روپ میں اور صدیوں پرانے طرز زندگی کی صورت میں رواں دواں دیکھا ہے ذرا تصور کیجئے بلوچستان کے ان ان گنت خانہ بدوش قبائل کا جو بدلتے موسموں کے ساتھ ساتھ ساری زندگی بلوچستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرگرم سفر رہتے ہیں جہاں قدرتی چشموں کا پانی اور مویشیوں کے لیے سبزہ ملا، پڑاو ڈال دیا اور پھر جب بھی اس جگہ سے جی بھرا، خیمے اکھاڑے اور دوبارہ سرگرم سفر ہو گئے۔

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

یا

جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی!

---

4 ایضاً، ص 412 5 ایضاً، ص 306

6 ایضاً، ص 403

7 ایضاً (بانگ درا) ص 259

شعر کو محض شعر کے طور پر پڑھنے، سمجھنے اور لطف اندوز ہونے والے اہل نظر کے

لیے یہ مصرع علاقائی نوعیت کا ہوگا، لیکن مجھے یہ مصرع ان جیالوں کا ترجمان دکھائی دیتا ہے جو بلوچستان کے بلند و بالا پہاڑوں کے خشک دامن میں زیر سطح جوئے شیریں کو تلاش کرتے ہیں اور پھر زندگی اور نمو کے اس سرچشمے کو پہاڑ کی بلندی سے میلوں دور کھیتوں اور باغات تک پہنچانے کے لیے کاریزیں تعمیر کرتے ہیں۔

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر

یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ!

ممکن ہے آپ اسے محض بلند ہمتی اور عزم و استقلال کی تلقین کہیں میرے نزدیک یہ بلوچستان کی ایک قابل فخر دلیرانہ روایت کا بیان ہے وہاں کلاہ اور طرہ دستار واقعی عزم بلند کی علامت ہے اگر بلوچ شاعر کہتا ہے یو ان کی چوٹیوں کو سر کرنا ہو تو سر کو ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھو کہ سربلندی کے لیے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے، کلام اقبال میں خطہ بلوچستان کے فکرواحساس اور جیتی جاگتی زندگی کی یہ بھرپور ترجمانی و عکاسی قدم قدم پر ملتی ہے یہی سبب ہے کہ اہل بلوچستان بھرپور ترجمانی و عکاسی قدم قدم پر ملتی ہے یہی سبب ہے کہ اہل بلوچستان میں سے جس جس کو اقبال کی بارگاہ فکر تک رسائی حاصل ہے وہ انہیں اپنا شاعر تصور کرتا ہے اور بلاشبہ یہ بات ان کی عظمت اور آفاقیت پر دلالت کرتی ہے اور اس امر کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اقبال پاکستان کے قومی شاعر اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد، ہر قوم اور ہر خطے کے ترجمان ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ ان کی اس عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے میں نے اور میرے بہت سے ہم قلم دوستوں نے کلام اقبال کو بلوچی، پشتو اور براہوی زبانوں میں منتقل کر کے بلوچستان کے ان لاکھوں لوگوں تک پہنچانے کی

کوشش کی ہے جو کلام اقبال کے فکری پہلوؤں سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے۔

مناظر فطرت کے مطالعے میں بھی علامہ اقبال کے نقطہ نظر میں جہاں آفاقیت ہے وہاں ان کی شاعری میں خطہ بلوچستان کی زمینی فضا،

---

8 ایضاً (''بال جبریل'') ص 338

اس کی مٹی کی خوشبو، اس کے پہاڑوں، چشموں، ندی نالوں اور ریگستانوں کا جلال و جمال پوری تابانی اور پوری اپنائیت کے ساتھ نظر آتا ہے مجھے ان بزرگ دانش وروں سے اختلاف ہے جو علامہ اقبال کی بعض ایسی نظموں کے بارے میں بیرونی فلسفیانہ موشگافیوں اور درآمد شدہ نظریات کی روشنی کو معیار بنا کر یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کی ابتدائی شاعری کا حصہ ہیں میری ناقص رائے میں وہ دراصل یہ بھول جاتے ہیں کہ عمر کے جس حصے میں علامہ اقبال نے فطرت کے اس قرب کی گرمی کو محسوس کیا ہے اور اس کے لیے بے ساختہ پن اور قدرتی لمس کا ادراک حاصل کیا ہے وہی نرم و گرم جذبوں کے بہار و شباب کی عمر ہوتی ہے اس میں بڑھاپے کی پختگی کی اعلی علمی سطح اور صفت نسبتاً کم ہوتی ہے، لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جذبوں کا خروش اظہار کو زیادہ والہانہ پن عطا کرتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ ان بزرگ دانش وروں پر بھی کبھی جوانی آئی ہو گی اور جن نظریات اور فلسفوں کے زیر اثر وہ آج اپنے قلبی واردات کی بنیاد علمی حادثات کو بناتے ہیں جو شیکسپیئر کو انڈین کالی داس کہنے کے بجائے کالی داس کو انڈین شیکسپیئر کہتے ہیں

انہیں مجھ ہیچ مدان سے بہتر طور پر علم ہو گا کہ اقبال کی روح کا سرچشمہ کسی

معاون ندی نالے کے سہارے رخ بدلنے کے بجائے خود ہی اپنی زمین، اپنے دین اور اپنی ذات کے سمندر میں منتج ہوتا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش
کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے
آغوش میں شب کے سو گئی ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا
قدرت ہے مراقبے میں گویا
اے دل! تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا
وادی کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!

---

9 ایضاً ("بانگ درا") ص128

10 ایضاً ("بال جبریل")" ص392

"ارمغان حجاز" میں "بڈھے بلوچ کی نصیحت" اقبال کی مشہور نظم ہے آپ سب نے بارہا پڑھی ہوگی آج کی محفل میں اس نظم کے چند اشعار ایک بلوچ کی

زبان سے سنیئے شاید اس طرح اس کی لذت اور معنویت مزید اجاگر ہو اور ایک ''بڈھے بلوچ'' کی زبان سے جولافانی پیغام دیا گیا ہے اس کا نقش ہر دل پر تازہ ہو سکے۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا

اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی، نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل

وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر

کہتے ہیں کہ شیشے کو بنا سکتے ہیں خارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص

کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیر امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاص عمل مانگ نیا گان کہن سے

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!

---

11 ایضاً (''ارمغان حجاز'') ص 257-258

فکروفن اقبال*

پریشان خٹک

فکر کی ماہیت اور فن کی ہیئت چند در چند ہے شاعری خارجی حقیقت اور داخلی صداقت کی بیک وقت مظہر ہے فکر یا خیال جو اس کا اظہار کرتا ہے اور فن جو اس کا ذریعہ بنتا ہے، ایک بڑا نکتہ آفریں ہے، اور دوسرا بہت پہلو دار پھر جب ان دونوں کو کلام اقبال کے حوالے سے زیر بحث لایا جائے تو ان کے تنوع اور بوقلمیت کا کوئی شمار و اندازہ نہیں رہتا ہماری اردو اور فارسی، بلکہ جملہ مشرقی، شاعری میں کچھ ٹکے بندھے اسلوب رائج رہے ہیں جو سکہ بند ہیں ہم انہیں کلاسیکی قرار دے کر شعر میں فکروفن کا مطالعہ اسی کے خاص پیرایے میں کرتے ہیں، مثلاً غزل گو شعرا کے بیان میں تصوف، محبت، موت اور زندگی کی باتیں، پرانی مثنویوں میں روایتی رومانی داستانیں، قصیدے میں مبالغہ و غلو کے ساتھ تشبیب و گریز کے بعد مدح سرائی، مرثیے میں منظر نگاری اور رزم آرائی بڑی آسانی سے بات کی اور کہی جاسکتی ہے۔

اقبال کو ہم مندرجہ بالا شعرا کی صف میں فکروفن کے اعتبار سے کہیں بھی نہیں کھڑا کر سکتے، حالانکہ انہوں نے قریب قریب ہر صنف سخن میں خامہ فرسائی کی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ فکر اور خیال ان کا انہی سمندروں میں غواصی کر کے موتی نکالتا رہا جو عام طور سے اردو، فارسی بلکہ جملہ مشرقی شعرا کی شناوری کا بسیط بساط رہے۔ وہی محبت اور عشق، وہی موت و حیات، وہی جمال و حسن، وہی تاریخی

داستانوں کے حوالے، ہجو بھی، مدح بھی، سب عالم گیر اقدار اور سچائیاں،

*21 اپریل 1981 کو منعقدہ یوم اقبال پر پڑھا گیا

جو مشرقی ادب کا طرہ امتیاز ہیں حیرت مگر یہ ہے کہ نہ اقبال کی غزل روایتی غزل کے مزاج کی حامل ہے، نہ ان کی کوئی مثنوی ''گلزار نسیم'' اور مثنوی ''زہر عشق'' کے انداز کی ہے، بلکہ ان کے فکر نے تصوف، فقر، خودی ایسے مسلکوں کو بھی بالکل نئے پیرائے میں ڈھال کر پیش کیا۔

اقبال اپنے آپ کو شاعر نہیں کہتے بلکہ وہ اس ذریعہ شعر سے علام حکیمیہ کی آبیاری کرتے ہیں ان کا اپنا شعر ہے

بنی خیر ازاں مرد فرودست
کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

لہذا میں ان کی شاعری کو عقلانی و ذوقی اور ان کے فکر کو درک و دریافت پر محمول جانتا ہوں ایسا بھی نہیں ہے کہ فکر کے امتیازی رنگ اور انفرادی آہنگ کے سبب ناخن فکر کی نادرہ کاری کا معجزہ وجود میں نہیں آیا فن کی جلوہ سامانی مدھم نہیں کہ سادگی، اظہار میں برجستگی، بیان اور رنگینی، زبان کا سامان فراہم ہے۔ جوش و اصلیت پر البتہ مبالغہ آرائی اور مضمون آفرینی کی چھاپ نہیں ہمیں ان کے ہاں ندرت خیال کے ساتھ تراکیب کی چستی، بندش کی درستی، زبان کی پختگی اور موزونیت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں

فکر اقبال کا محور ''وقار زندگی'' ہے ان کی تمام تر شاعری میں یہی ایک پیغام موجود ہے راز دان دانش نو اقبال خزائن علم و فلسفہ شرق و غرب پر پورا تسلط رکھتے

تھے وہ صوفی نہیں تھے، نہ وحدت وجودی تھے ان کا پیغام بیداری، آزادی اور سرفرازی کا پیغام تھا، کاہلی، بے کاری، ناتوانی، درماندگی کو کفر و گمراہی جانتے تھے انسان کو عظیم و بزرگ، خلیفہ و نائب خداوندی مانتے تھے اور مسلمانان عالم کی طرف سے انہوں نے تمام بشریت کو پیام محبت دیا شراب، صوفی، افیون شاعر، فریب ملا کو مسلمان کے حق میں سم قاتل سمجھتے تھے انہوں نے ''اسرار خودی'' میں ''فرد'' کو شجاعت، پامردی، راستی، استغنا اور بردباری کے خواص اپنانے کی دعوت دی، جس سے خودی اور خود داری پیدا ہوتی ہے ''رموز بے خودی'' میں فرد کو بے خودانہ جماعت

---

1 ''کلیات اقبال فارسی'' (''گلشن راز جدید'') ص538

میں گم ہو کر عظمت و بزرگی حاصل کرنے کا درس دیا۔ اسی طرح فقر جہاں کشائی کہ امانت مصطفائی ہے اس فقر سے، جو نام نہاد مدعیان خانقاہ نشینی کا پیدا کردہ ہے کہ مرید کو مراد کے چکر میں ڈال کر زبونی و گمراہی کا باعث بنتا ہے، ممیز کیا اور ''الفقر فخری'' کی تابناک صورت دکھائی۔

''وقار زندگی'' کے حصول اور بحالی کے لیے، اقبال نے شاعری کو بالکل نئے ڈھب سے استعمال کیا انہوں نے فن کی تمام اقدار کو ملحوظ رکھا، کسی روایت کو مجروح نہ کیا غزل، نظم، مثنوی، مسدس کے اسالیب ہی میں اپنے افکار کو پیش کیا بلکہ پرانی تشبیہات، صنائع بدائع اور شعریت کے دیگر محاسن بھی ان کے مدنظر رہے۔ زبان سے گل و بلبل، زلف و رخسار کی تراکیب بھی اختیار کیں، لیکن اس کے باوجود ایک ایسی طرز شاعری کی اپنائی کہ جو کلیۃ ان کی اپنی تھی نہ پہلے وہ انداز اردو ادب میں

کہیں پیدا ملتا ہے اور نہ ان کے بعد کوئی شاعر کامیابی کے ساتھ اس کی نقل یا تتبع کر سکا۔ ان کا فکر بیشتر تلمیحات کے پس منظر سے ابھرتا ہے اور ان کا فن محاکات کا فن قرار دیا جا سکتا ہے۔

اقبال کا نصف کلام تاریخ، اسلامی روایات اور اہل مغرب کے اقوال اور شعرائے مشرق کے اشعار پر استوار ہے ان کا رہوار فکر ان تمام وادیوں میں عجیب عجیب طرز سے تیز گام اور آہستہ خرام دکھائی دیتا ہے جب تیز ہو تو براق، طبع کا سماں بندھا تا ہے، جب ہلکا چلے تو آہستہ راں اے سارباں کی حدی سنائی دینے لگتی ہے مگر جیسا کہ میں نے کہا اقبال کا میدان فکر اتنا وسیع ہے کہ مختصر وقت میں اس کے کسی بھی حصے کا مکمل احاطہ ناممکن ہے مجھے بھی اب یہی دشواری پیش ہے صرف تاریخ کے حوالے ہی سے اگر بات کی جائے تو پورا دفتر تیار ہوتا ہے، تعلیم، جمہوریت، وطنیت، مطالعہ، فطرت، حکمت، اجتہاد، عورت، زندگی، عشق کسی بھی پہلو پر سرسری جائزے کا تنگی، وقت اجازت نہیں دیتی انہوں نے اپنے فلسفہ فکر کا اظہار بصورت نثر انگریزی میں اور بصورت شعر آزادی بخش اردو اور فارسی میں کیا ہے۔

میں اس بارے میں ان کے فکر کا جائزہ مختصراً ایک نئے پہلو سے لے کر اس مضمون کو ختم کر دوں گا اقبال نے مغرب کا بڑا دقیق مطالعہ کیا مغربی ادب پر ان کی بہت گہری نظر تھی اردو و فارسی شاعری میں انہوں نے مغربی ادب کے بڑے جاندار حوالے جابجا دیے ہیں اور دانش وران فرنگ کے نظریات کو بڑی خوب صورتی سے اردو اور فارسی کا جامہ پہنچایا ہے انہوں نے بسا اوقات یہ ترجمے اپنی برجستگی سے کیے ہیں کہ ان پر ترجمے کا گمان بھی نہیں ہوتا اور وہ اتنے مکمل ہیں کہ اصل کا لطف

ان میں آتا ہے پھر انہوں نے جو خیالات اس غرض سے چنے ہیں ان سے فکر کے حسن انتخاب کا جوہر بھی خوب کھلتا ہے بعض اوقات ان افکار کے ساتھ اپنا نظریہ بھی پیش کر دیا ہے فکر کا یہ موازنہ، اگر اس پر غور کیا جائے، تو بڑا دل چسپ ہے اس میں فن کی ہنر کاری بھی شامل ہے میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔۔۔۔شوپن ہار کی قنوطیت،۔۔۔۔شوپن ہار اور نیٹشے اقبال نسخہ تجویز کرتے ہیں:

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خو گر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

غالب کا خیال بھی قریب تر ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج

اسی کتاب میں محبت رفتگاں میں ٹالسٹائے، کارل مارکس، ہیگل، مزدک نظریات۔۔۔محنت کے باب میں۔۔۔کہ جان خدا دادرا خواجہ بجامے خرید، آدم از سرمایہ داری قاتل آدم شد است۔۔۔فطرت اضداد خیز لذت بیکار داد۔۔۔خواجہ و مزدور را آمر و مامور را نعمت گم گشتہ خود را زخسرو باز گیر۔۔۔جس کے بعد ان کی اپنی نظم۔۔۔۔جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی۔۔۔فکر کی کتنی ہموار اڑانوں کا پتہ دیتی ہے۔

جمہوریت کے متعلق ان کے فکر نے لینن اور قیصر ولیم کا مکالمہ تخلیق کیا دونوں کا ایک ایک شعر ان کی بحث کا حاصل ہے۔

شرزار آتش جمہور کہنہ ساماں سوخت
ردائے پیر کلیسا، قبائے سلطاں سوخت

2 ایضاً (''پیام مشرق'') ص 325　　3 ایضاً ص 385

ورولیم کی بیان کردہ یہ حقیقت:

نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن ہست

یعنی کمیونزم نظام بھی تو مزدوروں کا استبداد وجود میں لا سکتا ہے۔جمہوریت کے باب میں ان کا فکر ہمیشہ متوازن نظریے کا حامی رہا۔ Tyranny of majority on minority اس کی سب سے بڑی خرابی ہے اور پھر یہ وہ طرز حکومت ہے جس میں:

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یا

اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست

دونمونے پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا فلاسفروں کے جس فکر سے ان کے فکر کو کہنے کا جواز ملا ایک ایک شعر میں ان کو کسی خوبی سے نمایاں کیا ہے، لاک، کانٹ اور برگساں انگریز، جرمن اور فرانسیسی حکما ہیں:

لاک:

ساغرش را سحر از بادہ خورشید افروخت
ورنہ در محفل گل لالہ تہی جام آمد

کانٹ:

فطرتش ذوق مے آئینہ فامے آورد
از شپستان ازل کوکب جامے آورد

برگستان:

نہ مے از ازل آورد نہ جامے آورد
لالہ از داغ جگر سوز دوامے آورد

برگستان ہی نے یہ نکتہ آفرینی بھی کی ہے

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

اوراقبال کا یہ شعر:

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

4 ایضاً، ص 380

5 ''کلیات اقبال اردو'' (''ضرب کلیم'') ص 211

6 ''کلیات اقبال فارسی'' (''پیام مشرق'') ص 380

7 ایضاً، ص 381 8 ایضاً، ص 388

9 ''کلیات اقبال اردو'' (''بانگ درا'') ص 108

ایک جام کے حوالے سے تینوں کی کیفیت فکر کے ساتھ فن کا بھی کمال ہے

اب براؤننگ اور بائرن کو دیکھیے

بے پشت بود بادہ سر جوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

از منت خضر نتواں کرد سینہ داغ

آب از جگر بگیرم و در ساغر افگم

خضر کے حوالے سے دونوں کی شاعری کا انداز کس خوب صورتی سے پیش کیا ہے!

ایسی مثالیں بے شمار ہیں مشرق کے حکما اور شعرا کے حوالے سے بھی ان کا فکر ایسی ہی جولان گاہ میں محو خرام ملتا ہے یہ ایک زاویہ ہے جس پر پہلے شاید غور نہیں ہوا، اور ان کے اظہار خیال کے اس پیرایے پر کام کیا جا سکتا ہے اس ضمن میں گوئٹے کے ''فوسٹ'' کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے

قصہ بیان ابلیس و حکیم

زیر کی ز ابلیس عشق از آدم است

غالباً! کیٹس کا قول ہے، فلسفے سے تمام طلسم یک دم ٹوٹ جاتے ہیں اقبال کے ہاں بھی فلسفہ تمام تر عقل کے تابع ہے، وہ اسے کوئی ضابطہ حیات نہیں مانتے تھے ان کا شعر ہے:

نہ فلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو

یہ دل کی موت! وہ اندیشہ و نظر کا فساد!

ان کو عجیب نوع کی قلندری سے پیار تھا جس کی اساس یہ شعر بنتا ہے:

با ہر کمال اند کے آشفتگی خوش است

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

اور ان کے فکر میں یہی جنون گویا رواں دواں ملتا ہے

10 ''کلیات اقبال فارسی'' (''پیام مشرق'') ص382

11 ایضاً ص386

12 ایضاً ص388

13 ''کلیات اقبال اردو'' (''بال جبریل'') ص326

14 ایضاً، (''بانگ درا'') ص242
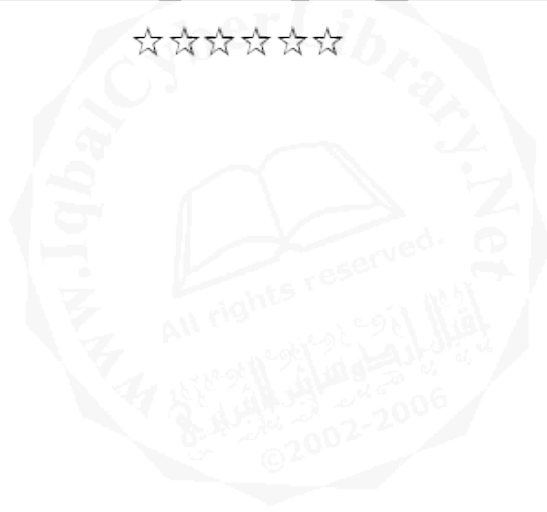
پیغام اقبال*

سرجیت سنگھ لانبہ

لوگ جبریل پہ کرتے ہیں گمان اقبال
مجھ کو اقبال پہ ہوتا ہے گمان جبریل

سب سے پہلے میں اپنا مختصر سا تعارف کروا دوں میں کوئی ادیب ہوں نہ شاعر، نقاد ہوں نہ محقق بس سینے میں ایک محبت بھرا دل اور منہ میں ایک ٹوٹی پھوٹی زبان رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے میں جو کچھ آپ کو نظر پڑتا ہوں وہ بعد میں ہوں، پہلے ایک انسان ہوں اور اس فخر انسانیت کا تہ دل سے احترام کرتا ہوں جو آفتاب بدایت بن کر فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور جس کی شعاعوں سے مشرق و مغرب جگمگا اٹھے۔ برصغیر ہند بھی اس روشنی سے محروم نہیں رہا اور یہاں بھی دین برحق کے داعیوں نے اپنی بساط درویشی آراستہ کی اور وہ پیغام جو ایک نبی امی نے دیا تھا اس کو دھڑکن دھڑکن پہنچایا اقبال بھی اسی پیغام کا نقیب ہے

آج سے بیالیس سال پہلے علامہ اقبال اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے لیکن دھڑکتے ہوئے دلوں اور دمکتے ہوئے ذہنوں میں وہ آج بھی زندہ ہیں وہ ساز خاموش ہو گیا لیکن اس کی جھنکار ابد تک سنائی دیتی رہے گی وہ پھول مرجھا گیا لیکن اس کی خوشبو ہر عہد کو مہکاتی رہے گی علامہ کا یہ شعر آج ان پر صادق آتا ہے

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اسے

کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیانے رہے

بموقعہ یوم اقبال 21اپریل 1980پڑھا گیا

1 ''کلیات اقبال اردو'' (''بانگ درا'') ص 187

اقبال جیسی عظیم شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں ان کی عظمت اور بلندی ہمارے خراج کی محتاج نہیں بلکہ ہم ایسا کر کے اپنے باشعور اور بیدار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں میں کوئی اتنا باشعور تو نہیں لیکن علامہ کا ایک ادنیٰ سا عاشق ضرور ہوں 9 اپریل کی دوپہر کو جب میں نے سرحد پار کر کے اس دھرتی پر قدم رکھا تو میری پہلی منزل مزار اقبال تھی بھگتی پلکوں کے ساتھ میں نے وہاں سورہ فاتحہ پڑھی، پھر ایک نعت شریف اور اقبال کا بہت سا کلام ان کی بارگاہ روح میں پیش کیا اور یوں میری دیرینہ خواہش کی تکمیل ہوئی۔

دراصل علامہ اقبال کسی ایک قوم یا ملک کے شاعر نہیں تھے نہ ہی ان کو شاعر ہندوستان یا شاعر پاکستان کہ کر ان کی لامحدود شخصیت کو محدود کیا جا سکتا ہے سورج مشرق سے ضرور نکلتا ہے لیکن اس کی وراثت نہیں بن جاتا مغرب والوں کا بھی اس پر پورا حق ہے یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال کے اشعار کی بنیاد قرآن مجید ہے اور مسلمان ان کے مخاطب ہیں لیکن قرآن مجید کی تعلیمات اور اصول تمام نوع انسان کی رہ نمائی کے لیے ہیں، کسی ایک فرد کے لیے نہیں میں خود قرآن شریف کی عظمت کا قائل ہوں اور دل سے اس مقدس کتاب کا احترام کرتا ہوں اگر دنیا کا کوئی فرد یہ سمجھتا ہے کہ علامہ اقبال اس کی وراثت ہیں یا علامہ اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے ہے تو میں معذرت کے ساتھ گزارش کروں گا کہ میں ایسے کسی اقبال کو نہیں

جانتا میں تو اس اقبال کا مداح ہوں جس کا پیغام یہ ہے کہ:

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے

میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ دنیائے ادب سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ جو اپنی ذات میں علم و ادب کی ایک انجمن تھا اس کے حلقہ بگوش ہونے کا شرف رکھتا ہوں میری اس مرد قلندر کے ساتھ والہانہ محبت میں بھی میرا کوئی دخل نہیں یہ بھی اس کے فلسفہ خودی، اس

2 ایضاً ص 141

کے انداز فقر اور اس کے جذبہ عشق کا اعجاز ہے جو اس کے کلام کی بدولت مجھ تک پہنچا اور آج مجھے یہ عزت ملی کہ مجھ جیسے کم سخن کو اس کے حضور چند حروف پیش کرنے کا موقعہ ملا فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کی منزلیں تو بہت کٹھن ہیں میں تو فنا فی الاقبال ہی ہو سکا ہوں اب یہ راستہ مجھے کہاں تک لے جاتا ہے، یہ لے جانے والا جانے

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے

جو بے عمل پہ بھی رحمت، وہ بے نیاز کرے

3 ایضاً ص 106

☆☆☆☆☆

محمد اقبال کا قلمی چہرہ*

خواجہ حسن نظامی

سروقد، گندمی رنگ، پرتمکنت چہرہ، داڑھی صاف، آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا مے کدہ ہے تو دوسری میں شعر خیام کا خم خانہ، جسم پنجابی، دماغ فلسفی، خیال صوفی، دل مسلمان، مسلک حق پسندی، خدمت مذہب، مسلمانوں کی بہبودی، مزاج میں سنجیدگی، متانت اور استقلال۔۔۔۔مسلمان کی نظر میں محبوب اور ہندو کی نظر میں اپنی صاف بیانی کی وجہ سے غیر محبوب ان کی قابلیت کو سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں کبھی بہار نہ آتی۔

---

*منقول از سید نذیر نیازی، ''دانائے راز'' (لاہور: اقبال اکادمی، 1979ص 260

☆☆☆☆☆☆

اسلامی بلاک۔۔۔۔۔۔اقبال کی نظر میں

آغا یمین

آج جب کہ پندرھویں صدی ہجری کا سورج طلوع ہو رہا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام میں بھی ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہے آج ہمیں چاروں طرف تمام اسلامی ممالک میں ایک اضطراب اور اجتہاد کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔۔۔۔کہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر ہے تو اہل عرب اور اسرائیل کے درمیان مسئلہ بیت المقدس دراصل یہ کوئی علاقائی جنگ نہیں بلکہ ایک نظریاتی جنگ ہے جس کی بین دلیل یہ ہے کہ مسئلہ بیت المقدس محض اہل عرب اور اسرائیل کے درمیان جنگ نہیں بلکہ بیت المقدس مسلمانوں کے قبلہ اول ہونے کی حیثیت سے پورے اسلامی ممالک کا مسئلہ ہے اسی طرح افغانستان میں روس کی جارحیت اور توسیع پسندی کے خلاف افغان مجاہدین کا جہاد فی سبیل اللہ ایک نظریاتی جنگ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ عصر حاضر میں ملت اسلامیہ کے درمیان اس اضطراب و اجتہاد کی لہر کا محرک مفکر اسلام اقبال ہے، جن کی دور رس نگاہ نے آنے والے دور یعنی عصر حاضر کی عکاسی، ایک پیش گوئی کی صورت میں ''جواب شکوہ'' میں پہلے ہی سے کر دی تھی انہیں معلوم تھا کہ ایک روز عالم اسلام کے چمن میں خون شہدا کی لالی گل بر انداز ہو گی اور جب بہار آئے گی تو گلستان اسلام ہر قسم کے خش و خاشاک

سے خالی ہو جائے گا، اور یہ پیشین گوئی اس وقت صحیح ثابت ہوگی جب کہ عالم اسلام کے گردوں کا رنگ عنابی ہوگا تو پھر سمجھیے کہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے اس کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے!

پھر اس کی وضاحت یوں بھی کی:

امتیں گلشن ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محروم ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں
سینکڑوں بطن چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخل اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

نخل اسلام کو برومندی کا نمونہ بنانے کے لیے لازم تھا کہ پہلے اقبال ملت اسلامیہ کے راہ گم کردہ منتشر ہجوم کو اکٹھا کرتے، پھر ایک بانگ درا کے توسل سے انہیں ایک منظم کارواں کی صورت میں اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی رہ نمائی کرتے

لہذا انہوں نے ایسے ہی کیا۔

''پیام مشرق'' میں لالہ طور کے عنوان سے قطعہ نمبر 140 میں اقبال نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

عجم از نغمہ ہامے من جواں شسد
ز سودایم مناع او گراں شہ
ہجومے بود راہ گم کردہ در دشت
ز آواز درایم کرواں شد

یہاں عجم سے مراد محض ایران نہیں ہے بلکہ تمام اسلامی ممالک شامل ہیں عصر حاضر کی اسلامی دنیا میں جو ''اسلامی بلاک'' کا رجحان

---

1 ''کلیات اقبال اردو'' (''بانگ درا'': ''جواب شکوہ'' ص 205

2 ''کلیات اقبال فارسی'' (''پیام مشرق'': ''لالہ طور'' ص 241

دکھائی دے رہا ہے اس کے محرک بھی اقبال ہی ہیں اس میں شک نہیں کہ اقبال کا ذہن ابتدائی دور میں قومیت کے مغربی تصور یعنی نیشنلزم سے متاثر رہا، لیکن پھر بالغ النظر ہونے کے بعد انہوں نے فکر ملی اسلام کے زیر اثر اس قومیت یا وطنیت کے مغربی تصور سے کنارہ کشی کر کے واضح طور پر اتحاد ملی اسلامی کا پیغام دیا ہے اگر ہم علامہ اقبال کے افکار و اشعار کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ تقریباً 1910 سے لے کر 1930 تک تو یہ کیفیت رہی، لیکن 1930 کے بعد کی شاعری جو انہوں نے اکثر و بیشتر فارسی میں کی وہاں اقبال کی بالغ نظری کا پتا چلتا ہے

اس امر کی تصدیق خود علامہ اقبال کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے 1931 میں ''بمبے کرانیکل'' (Bombay Chronicle) (18 ستمبر، 31 دسمبر 1931) کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے دیا:

There is no doubt that my ideas about "
nationalism have undergone a definite change. in my College days I was a zealous Nationalist which i am not now. the change is due to a maturer thinking. it is unfortunate that my later writings are all in persian which is little
'understood in this country

ترجمہ: ''اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قومیت کے بارے میں میرے خیالات میں قطعی نوعیت کی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے کالج کے زمانے میں میں پر جوش قوم پرست تھا، مگر اب ایسا نہیں ہے یہ تبدیلی پختہ سوچ کی بنا پر ہے بد قسمتی سے میری بعد کی تحریریں فارسی میں ہیں جو اس ملک میں نہیں سمجھی جاتی''

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال کے ذہن میں یہ تبدیلی واقع ہوئی دراصل وہ علامہ اقبال کو بھی اپنی بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے تبدیلی کرنا پڑی جب ہم اس دور کے سیاسی

3ملاحظہ ہو Letters and writings of Iqbal ص 58

4ترجمہ ڈاکٹر وحید قریشی، '' اقبال اور پاکستانی قومیت'' (لاہور مکتبہ

محرکات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو برصغیر پاک و ہند میں مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کش مکش تھی تو دوسری طرف ترکیہ میں، خلاف کے خاتمے پر، اس دور کی خلافت کا تصور وہ نہ رہا تھا جو اسلام نے پیش کیا تھا لہٰذا اب لازم تھا کہ مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے مسلمان پہلے اپنی اپنی جگہوں پر خود مضبوط ہوں، پھر اپنی اپنی ریاستوں کو مضبوط کر کے عالمی سطح پر متحد ہوں اس صورت میں سید جمال الدین افغانی نے جو ملت اسلامیہ کو اتحاد عالم اسلمی کا تصور پان اسلامزم (Pan.islamism) کی صورت میں پیش کیا تھا علامہ کے لیے ایک نئی معنویت رکھتا تھا لہٰذا اقبال نے نہ صرف اسے دل سے قبول کیا بلکہ اس کی ترویج و توسیع بھی کی اقبال کے اردو کلام میں بالعموم اور فارسی کلام میں بالخصوص اس کا اظہار عام ملتا ہے مثلاً ''رموز بے خودی'' میں ''ارکان ارساسی ملیہ اسلامیہ کے رکن اول'' توحید کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملت ابراہیمی کی حیثیت سے ہماری ملت کی اساس کا انداز ہی اور ہے اور اس کی اساس ہمارے دل کے اندر مضمر ہے اگرچہ ہم مختلف قبیلوں، اور جغرافیائی اعتبار سے مختلف سرحدوں میں بٹے ہوئے ہیں، لیکن ہمارے دین اسلام کا رشتہ ایک ہی ہے جس میں منسلک ہونے کے بعد ہم ایک ہی ملت اسلامیہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں، یا یوں کہیے کہ ہم اس تیر خوش پیکان کی مانند ہیں جس کے دو حصے جدا جدا ہیں ایک تو تیر کا دستہ اور دوسرا تیر کی نوک، لیکن جب ان دونوں کو جوڑا جائے تو تیر خوش پیگان کی مانند ایک تیر ہی کہلاتا ہے، یعنی جب ہم کلمہ توحید کے رشتے میں منسلک ہو گئے تو

این وآں کی قید و بند سے آزاد ہو گئے تو پھر کیا عجمی ہو یا عربی، کالا ہو یا گورا، ایرانی ہو یا تورانی، افغانی ہو یا پاکستانی، ہماری سوچ بھی ایک ہو گی، ہمارا دل بھی ایک ہو گا، ہمارا مدعا اور مال بھی ایک اور ہمارا طرز و انداز خیال بھی ایک ہو گا جب ہم میں ہم فکری اور ہم رنگی پیدا ہو جائے گی تو یقینی طور پر ہم خدا کی نعمت سے بھائی بھائی بن جائیں گے اور ایک زبان، ایک دل اور ایک جان ہو جائیں گے اس تمام فلسفہ اتحاد ملی اسلام کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے:

ما مسلمانیم و اولاد خلیل
از ابیکم گیر اگر خواہی دلیل

ملت ما را اساس دیگر است
ایں اساس اندر دل ما مضمر است

تیر خوش پیکان یک کیشیم ما
یک نما، یک بیں، یک اندیشیم ما
مدعاے ما، مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست
ماز نعمت ہاے او اخواں شدیم
یک زباں و یک دل و یک جان شدیم

پان اسلامزم اور سید جمال الدین افغانی اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پان

اسلامزم کا محرک کون تھا؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس کی صورت پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے؟

پان اسلامزم کا مفہوم۔۔۔۔ سب سے پہلے پان اسلام کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا پان (Pan) انگریزی کا لفظ ہے یہ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے ڈبلیو ٹی کننگھم (W.T.Cunningum) نے The nelson contemporary english dictionary میں اسم کے اعتبار سے اس کے معنی فرائی پان یا ایک کٹھالی کے دیے ہیں جس میں سونا پگھلا کر اس سے میل اور ریت جدا کی جاتی ہے لہذا فعل کے مفہوم میں اس کے معنی ہلانے، صاف کرنے یا فلم یا ٹیلی ویژن پر کسی خاص موضوع کو سمجھانے کی خاطر فوکس یا کلوز اپ یعنی بڑا کر کے قریب سے دکھانے کے ہیں (ص 358)

لہذا اس اعتبار سے پان اسلامزم کا مفہوم خس و خاشاک کو دور کر کے خالص با عمل مسلمانوں کے اتحاد کی تنظیم کے ہوئے

---

5 ''کلیات اقبال فارسی'' (''رموز بے خودی'') ص 93

پین اسلامزم کے محرک سید جمال الدین افغانی تھے

اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس لیے کہ ترکیہ میں خلافت کے ختم ہونے پر ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو تمام اسلامی ممالک کو، خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، اسلامی فکر کے رشتے میں منسلک اور متحد کر کے ایک باعمل خلافت راشدہ کا احیا کر دے، اور پیغمبر آخر الزمان رسول مقبول ؐ کے لائے ہوئے دین اسلام کو عملی طور پر نافذ کر کے ایک ایسا اسلامی بلاک قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد

ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ پر مبنی ہوں پھر یقینی طور پر خدا کی جانب سے اکملت لکم دینکم کی زیر سر پرستی چین اسلامزم کا یہ اسلامی بلاک ایک ایسی سپر پاور ہوگا جو فطرت انسانی کے مطابق نہ صرف خود راہ مستقیم پر چلے گا بلکہ تمام اقوام عالم کی رہ نمائی اور اعانت کرے گا۔

چین اسلامزم کا مشتبہ مفہوم لیکن ہوا یہ کہ ایک فرانسیسی صحافی نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ چین اسلامزم کی یہ تحریک تمام مسلمان ممالک کو اکٹھا کر کے عیسائی مملکتوں کے خلاف ایک سازش ہے البتہ بقول علامہ اقبال کیمبرج یونیورسٹی کے آں جہانی پروفیسر براؤن نے اس کے اس مشتبہ مفہوم کی تردید کی تھی۔

مذکورہ "بمبئے کرانیکل" کے انٹرویو میں علامہ اقبال نے دسمبر 1931 میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے چین اسلامزم کی وضاحت نہایت واضح اور مدلل انداز میں یوں کی تھی:

But there is another sence in which the word should be used and it does contain the teaching of the quran. in that sence it is not a political project but a social experiament. islam does not recognise caste or race or colour. in fact islam is the out look on life which has really solved the colour question, at least in the muslim world, a question which modern

european civilization with all its achivements in science and philosphy has not been able to solve. pan islamism thus interpreted, was aught by the prophit and will live for ever.

---

2 دیکھے Letters and writings of iqbal ص 55-57

اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر وحید قریشی نے یوں کیا ہے:

''لیکن اس سے ہٹ کر اسے ایک اور مفہوم میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مفہوم قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے اس صورت میں یہ کوئی سیاسی منصوبہ نہیں بلکہ سماجی تجربہ بن جاتا ہے اسلام ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیازات تسلیم نہیں کرتا بلکہ یہ صرف اسلامی نقطہ نظر ہی ہے جس نے رنگ کے مسئلے کا کم از کم مسلم دنیا میں تو خاتمہ کر دیا ہے، جب کہ فلسفہ اور سائنس میں اپنی فتوحات کے باوجود جدید یورپی تہذیب اسی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے پین اسلامزم کی یہ تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور زندہ جاوید رہے گی۔''

علامہ اقبال کے مذکورہ بیانات کے مطابق یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے فکر نے وطنیت سے قومیت اور پھر قومیت سے فکر اسلامی کی منزل تک جو ارتقائی مراحل طے کیے ہیں وہ ان کی بالغ نظری کی بین دلیل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہی تدریجی فکری ارتقاء علامہ اقبال کے اردو اور بالخصوص فارسی کلام میں واضح نظر آتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ان کی وہ تمام پیشین گویاں جو انہوں

نے ماضی، حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے کہیں آج کافی حد تک صحیح ثابت ہو رہی ہیں، مثلاً جب ان کی نگاہ ماضی میں خلافت راشدہ کے صحیح نظام اسلامی پر پڑتی ہے تو اس کے احیا کے لیے ملت اسلامیہ کو ''بانگ درا'' میں ''دنیائے اسلام'' کے عنوان سے یوں پیام اجتہاد دیتے ہیں کہ:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

جب ہم علامہ اقبال کے اس نظریے کو آج کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو یہ ایک عین حقیقت بن کر دکھائی دیتا ہے عصر حاضر میں تمام اسلامی ممالک اسی نشاۃ ثانیہ کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

---

7 ڈاکٹر وحید قریشی، کتاب مذکورہ، ص 102

---

8 ''کلیات اقبال اردو'' (''بانگ درا'') ص 245

اقبال اور افغانی علامہ اقبال کے دل میں سید جمال الدین افغانی کے احترام کا اندازہ ان کی شہرہ آفاق فارسی تصنیف ''جاوید نامہ'' میں لگایا جا سکتا ہے جہاں ''فلک عطارد'' کے عنوان سے علامہ اقبال ''زندہ رود'' کی صورت میں اپنے پیر رومی کی قیادت میں جمال الدین افغانی اور ترک سالار سعید حلیم پاشا کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ میں گیا اور میں نے دیکھا کہ دو شخص قیام کی حالت میں ہیں ان میں سے سعید حلیم پاشا مقتدی ہیں اور ان کی امامت جمال الدین افغانی کر رہے ہیں یہ منظر دیکھ کر پیر رومی کا چہرہ ذوق و سرور کی کیفیت سے چمک اٹھتا ہے پھر رومی نے فرمایا کہ مشرق نے ان دو شخصیتوں سے بہتر اور کوئی شخصیت

پیدا انہیں کی ان کے ناخن نے ہماری مشکلات کا عقد کھولا ہے اور جہاں تک سید السادات مولانا جمال الدین افغانی کا تعلق ہے ان کی گفتار میں وہ تاثیر ہے کہ سنگ وسفال بھی جی اٹھتے ہیں ان کے نطق میں وہ تاثیر ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ بھی وجد میں آجائیں اور جبرائیل کی روح پاک بھی جھوم اٹھے ان کی تاثیر گویائی سے دل بھی سینے میں تڑپ اٹھتیں اور یہاں تک کہ قبروں سے مردے بھی شوالا اللہ کے ساتھ جی اٹھیں ان کی تقریر دھوئیں کو شعلہ اضطراب بخشتی ہے اور یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ بھی سوز و مستی میں جھوم اٹھتے ہیں ان کی گفتار سے تمام غیاب واسرار آشکارا ہو جاتے ہیں اور ام الکتاب یعنی قرآن گے رموز و نکات کے حجابات اٹھ جاتے ہیں ان تمام احساسات کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے:

رقم و دیدم دو مرد اندر قیام
مقتدی تاتار و افغانی امام
پیر رومی ہر زماں اندر حضور
طلعتش بر آسافت از ذوق و سرور
گفت مشرق زیں دو کس بہتر نزاد
ناخن شاں عقدہ ہامے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال
زندہ از گفتار او سنگ و سفال

ترا تے کر وے خلیل آید بوجد

روح پاک جبرئیل آید بوجد!
دل ازو در سینہ گردو ناصبور
شور الا اللہ خیزد از قبور!
اضطراب شعلہ بخشد دود را
سوز و مستی می دہد داوٗد را
آشکارا ہر غیاب از قرائتش
بے حجاب ام الکتاب از فراتش!

جمال الدین افغانی کا ہی یہ شعلہ اضطراب تھا جس کی تڑپ نے علامہ اقبال کے دل کو ایسا گرمایا کہ انہوں نے برسوں سے سوئی ہوئی ملت اسلامیہ کو شور الا اللہ سے جگا ڈالا۔

اقبال اور عصر حاضر آج جب کہ چودھویں صدی ہجری کا اختتام اور پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہو رہا ہے اور ہم علامہ اقبال کے کلام و افکار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اقبال نے ملت اسلامیہ کی رہ نمائی ایک بالغ النظر مفکر اسلام کی حیثیت سے کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار آج بھی ملت اسلامیہ کے لیے مشعل راہ ہیں اقبال کی روح پاک آج بھی ملت اسلامیہ کو بابانگ دہل ''پیام مشرق'' میں ''نقش فرنگ'' کے عنوان سے یہ پیام دے رہی ہے

وقت آں است کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم

یہاں لوح دل پاک بشستن کا پیام آج ہمارے اسلامی ممالک ایران و عراق

کے لیے وقت کی آواز بن کر دکھائی دے رہا ہے آج اقبال کی روح انہیں یہ پیام بھی دے رہی ہے کہ اے مسلم! اگر تو صاحب نظر ہے تو آنکھیں کھول اور دیکھ کہ زندگی ایک جہان دگر کی تعمیر کرنے۔

---

9 ''کلیات اقبال فارسی'' (''جاوید نامہ'') ص 60-61

---

10 ایضاً (''پیام مشرق'') ص 191

میں مصروف ہے جب کہ تو آپش میں ہی جنگ آزما ہے فرماتے ہیں

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیر جہان دگر است

اقبال کا آپٹیمزم (Optimism) یعنی (جائیت میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے ہاں رجائیت کا پہلو اس لیے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اقبال کی نگاہ دور رس نے ملت اسلامیہ کی کیفیت کو ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں رکھ کر بغور دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ''پیام مشرق'' کی اس نظم بعنوان ''پیام'' میں فرماتے ہیں:

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چوانجسم نگراں می بینم
دانہ ای را کہ بآغوش زمین است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

انہیں کامل یقین تھا کہ فکر بیداری ملت اسلامیہ کا وہ بیج جو انہوں نے زمین میں بویا تھا آنے والے زمانے یعنی آج عصر حاضر میں انہیں خاک کہن ملت اسلامیہ میں نئی نسل شاخ در شاخ برومند و جوان دکھائی دے رہی تھی، اور انہیں پندرھویں

صدی ہجری کے مستقبل میں ملت اسلامیہ کے خاک کہن میں ہر ذرہ انجم کی طرح چمکتا اور دمکتا دکھائی دے رہا تھا آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہے۔

اقبال کا پیام عصر حاضر کے نام اس تمام بحث کا لب لباب اور ماحصل یہ ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ علامہ اقبال کے افکار کے تراجم کر کے تمام اسلامی ممالک میں کثرت اور تیزی سے بھیجے جائیں، تا کہ اس ''اسلامی بلاک'' کا خواب، جو علامہ اقبال اور جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا، عملی طور پر پورا ہو سکے۔ دراصل جمال الدین افغانی نے ''پین اسلامزم'' کی تحریک کا آغاز کیا تھا اور علامہ اقبال نے اس میں

---

11 ایضاً، ص 192 12 ایضاً

پیش رفت یہ کی کہ ملت اسلامیہ کی آنے والی نئی نسل کو ''اسلامی بلاک'' بنانے کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار کر دیا ہے، اور عصر حاضر کی نوجوان نسل کے نام یہ پیغام ''بانگ درا'' میں ''طلوع اسلام'' کے عنوان سے یوں دیا ہے:

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے!

یہ نکتہ سر گزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ہمیں خدائے ذوالجلال کی رحمت سے یقین کامل ہے کہ اگر آج بھی ملت اسلامیہ علامہ اقبال کے اس عالم گیر پیام پر عمل پیرا ہو تو یقیناً پندرھویں صدی ہجری کا سورج ''اسلامی بلاک'' کی سرزمین پر علامہ اقبال کی اس پیشین گوئی سے طلوع ہو گا۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے!

---

13 ''کلیات اقبال اردو'' (''بانگ درا'') ص 280-269

14 ایضاً، ص 195

☆☆☆☆☆☆

کتب بغرض تبصرہ

ناشرین اور مصنفین حضرات سے التماس ہے کہ اپنی انگریزی اور اردو کتابوں پر ''اقبال ریویو'' میں تبصرے کے لیے دو نسخے ارسال کیا کریں۔ ایک نسخہ تبصرہ نگار کے لے اور دوسرا اقبال اکادمی کی لائبریری کے لیے۔

کوشش کی جاتی ہے کہ تبصرے بعجلت ممکنہ شائع کیے جائیں، لیکن اس کا انحصار تبصرہ نگار کی فرصت پر ہوتا ہے

کتابیں مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں:

مدیر، اقبال ریویو

112 میکلوڈ روڈ لاہور

☆☆☆☆☆☆

اقبال مغربی خاور شناسوں کی نظر میں

جگن ناتھ آزاد

اقبال نے مغرب، مغربی علوم وفنون اور مغربی تہذیب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے اقبال کے نقادوں نے اکثر بحث وتمحیص کا موضوع بنایا ہے، لیکن یورپ اور امریکہ کے مستشرقین نے جو کچھ اقبال کے بارے میں کہا اس پر ابھی پوری طرح سے توجہ نہیں دی گئی* حالانکہ یہ موضوع بھی اقبالیات کے تعلق سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

یوں تو اقبال کے فکروفن نے مستشرقین کی ایک بڑی تعداد کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے جن میں آرتھر آربری، ٹامس آرنلڈ، آر اے نکلسن، سوریئل، وہایٹ ہیڈ، میکٹگرٹ، ایچ، اے آر گب، گراہم بیلی، ای جی براؤن، کانٹ ویل اسمتھ، وکٹر کرنین، جے سی روم، ایڈورڈ ٹامسن، رش بروک ولیمز، الفریڈ گیاام، اوبالے، جی ای گرونے بام، رچرڈ سائمینڈس، جے اے ہیوڈ اور رابرٹ ویٹ مور (انگلستان)، اینے میری شمل، حییت، السارلش بنیسفڈر، جے ڈبلیو فک، برنڈ مینویل ولیچر اور پروفیسر ہیل (جرمنی)، لیوسی کلادمیترے، ہنری ماسے اور ایوا میوروو چ (فرانس)، آرتھر جیفری، ایساندر بسانی اور ایم نالینو (اٹلی)، یان ماریک (چیکوسلواسکیہ)، بابا جان غفوروف، مس ایم ٹی اسٹیپنٹس، گورڈن پلونوسکایا، این آئی پری گارینا اور این پی اینکی ییو (روس)، ولیم اوڈگلس، مسزلنڈا ملک ہفری لینڈ

ایبٹ، شیلا میک ڈونو اور کینتھ مارگن (امریکہ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

---

*اس سلسلے میں ڈاکٹر سلیم اختر کی مرتبہ کتاب ''اقبال ممدوح عالم'' (لاہور: بزم اقبال، 1978) ایک عمدہ مجموعہ پیش کرتی ہے مدیر ''اقبال''

لیکن میرے نزدیک ٹامس آرنلڈ کا نام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس نے اقبال کے زمانہ طالب علمی ہی میں اقبال کے جوہر قابل کو پہچان لیا تھا اور ان کے بارے میں یہ کہا تھا کہ اقبال ایسا طالب علم استاد کو محقق اور محقق کو زیادہ بہتر محقق بنا دیتا ہے یہ اس زمانے کی بات ہے جب اقبال ابھی گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اور اس وقت تک نہ اقبال خود یورپ پہنچ کر خاور شناسوں کے سامنے آئے تھے اور نہ ہی ان کا کلام یورپ تک پہنچا تھا۔

خاور شناسوں کی مذکورہ فہرست میں تینتالیس مصنفین کے نام ہیں اور ممکن ہے یہ فہرست نامکمل ہی ہو کیونکہ ایک تو یہاں ناموں کی فہرست پیش کرنا میرا مقصد نہیں، دوسرا مجھے اس بات کا دعویٰ بھی نہیں کہ میں ہر اس مغربی خاور شناس کے نام سے آشنا ہوں جس کی تحریروں میں اقبال کا ذکر آیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ان تمام کے تمام اہل قلم نے اقبال پر اس خیال سے قلم نہیں اٹھایا کہ وہ اقبال کی شاعری یا فلسفے کا تجزیہ کریں یا اس پر بحث کریں بلکہ بعض نے تو محض سیاسی موضوع پر لکھتے وقت اقبال ہی کے سیاسی بیانات یا تقریروں یا خطوط یا ملاقاتوں ہی کا ذکر کرنا کافی سمجھا ہے، مثلاً ایڈورڈ ٹامسن یا رچرڈ سائمنڈس

ان اہل قلم نے جنہوں نے اقبال کے کلام اور نثر کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اولیت کا حامل نام پروفیسر آر اے نکلسن کا ہے جنہوں نے 1920 میں

اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا دراصل یہی ترجمہ اول اول مغرب میں اقبال کی شہرت کا سنگ بنیاد بنا۔ اس وت تک اقبال کے کلام کا نہ تو کوئی انگریزی ترجمہ ہوا تھا اور نہ ہی انگریزی میں کوئی قابل ذکر مقالہ یا کتاب اقبال کے متعلق شائع ہوئی تھی۔ نواب مالیر کوٹلہ کے بھائی نواب سر افتخار علی خان، کے ٹی سی ایس آئی کی اقبال کے متعلق کتاب A voice from the east جس نے اقبال کا مغرب میں مزید تعارف کرایا، دو برس بعد 1922 میں شائع ہوئی۔

نکلسن کا یہ ترجمہ نکلسن کی اقبالیات اور اسلامیات سے غیر معمولی دل چسپی کا آئینہ دار ہے۔ اگرچہ اس میں کہیں کہیں ترجمے کی اغلاط موجود ہیں لیکن اس سے نکلسن کے کام کی عظمت پر حرف نہیں آتا۔ خواجہ غلام السیدین اس ضمن میں نکلسن کی ایک غلطی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''میں نے علامہ مرحوم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ نکلسن نے ''اسرار خودی'' کے ترجمے میں صورت طفلاں ز نے مرکب کی، کو غلط پڑھ کر نے کا ترجمہ Reed کرنے کے بجائے ز کو اس کے ساتھ ملا کر زن پڑھا تھا اور اس کا ترجمہ '' Woman '' کیا تھا'' اس کے ساتھ ہی سیدین صاحب لکھتے ہیں ''یہ ہیں ہمارے بہترین مستشرقین!'' نکلسن کی مذکورہ غلطی کے متعلق میں سیدین صاحب سے متفق ہونے کے باوجود ان کی اس طنزیہ رائے میں ان کا ہم خیال نہیں ہوں کہ ''یہ ہیں ہمارے بہترین مستشرقین!'' نکلسن یقیناً ہمارے بہترین مستشرقین میں سے ہیں اور اس قسم کے کسی سہو کی نشان دہی کر کے نکلسن کے سارے کام پر پانی پھیر دینا کوئی مستحسن بات نہیں جہاں تک اس

ترجمے کا تعلق ہے اس میں اغلاط اور بھی ہیں اور ان اغلاط کی اصلاح خود علامہ اقبال نے کی لیکن ان اغلاط کے باوجود نکلسن کے ترجمے کی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ بڑی بات یہ ہے کہ نکلسن نے اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کیا اور علامہ اقبال کے تصحیح کردہ ترجمے کی بنا پر اپنے ترجمے میں اصلاح کی اور ان تصحیحات کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن 1940 میں لاہور سے شائع ہوا۔

یہاں اس دوسرے ایڈیشن کی داستان کا ذکر ضروری تو نہیں لیکن چونکہ یہ ایک دل چسپ کہانی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ میں آرتھر آربری کے الفاظ میں آپ کو سناؤں آرتھر آربری Notes on iqbals asrar i khudi میں لکھتے ہیں:

After professor R.A. Nicholson,s death in 1945 his library was sold to a well known cambridge book seller as i was looking through the volumes offered to the public, i chanced upon a copy of his translation of iqbals asrar i khudi, in the first edition

---

1 شائع کردہ شیخ محمد اشرف، لاہور: 1925، ص 4

London, 1920 and was immediatly intrested to observe that this copy was heavily corrected, and annatated in a hand other than

the translators. on studying the chracter of the notes it seemed likely to me that these (and of course the corrections) emanated fron no other than sir muhammad iqbal himself. this supposition was strengthened when i found a few lines of dedication in a copy of one of his publications which he had sent as a persent to professor Nicholson. Probability at last became a certainty when i showed the book to mr javid iqbal, who is at persent studying with me in cambridge he confirmed that the corrections and annotations were indeed in the handwriting of his reverd father.

اس کے بعد اقبال کا نیا فارسی مجموعہ کلام شائع ہوا تو رینالڈ اے نکلسن نے ایک طویل مقالے کی صورت میں اس پر تبصرہ کیا اس مقالے میں پہلے نکلسن نے ان الفاظ میں اقبال کی دواؤں مثنویوں ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کا جائزہ لیا:

He regards reality as process o becoming, not as an eternal state. the tample.serana of

the absolute find not place in his scheme of things all is in flux. his universe is an association of individuals headed by the most uniqe individual. ie god their life consist in the fourmation aud cultivation of personality. the perfect man not only absorbs god himself in to his ego by assimilating divine attributes hence the essence of life is love which in its highest from is the creation of desires and ideals and the endeavour the realise them desires are good or bad according as they strengthen or weaken personality and all values must be determind by this standard.

یہاں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ نکلسن کی یہ تحریر 1924 کی ہے جب کہ اقبال کی نثری تصنیف Reconstruction of religious thought in islam ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی Reconstrustion of religious thought in islam میں تو اقبال نے اپنے فلسفے کو ایک مربوط صورت دی ہے لیکن محض ''اسرار خودی''، ''رموز بے خودی'' اور ''پیام مشرق'' کے مطالعے سے اقبال کے فلسفہ خودی، نظریہ خدا اور

اس کے زمان و مکاں کے تصور کو اس غیر مبہم، سلجھے ہوئے اور سریع الفہم انداز بیان میں پیش کر دینا ایک معجزے سے کم نہیں۔

پھر نیٹشے اور برگساں کے ساتھ اقبال کے ذہنی قرب و بعد کا ذکر کرتے ہوئے نکلسن اپنی خلش دل کا اظہار بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

the affinities with nietzsche and bergson need not be emphasised it is less clear, however, why iqbal identifies his ideal society with Mohammads conception of islam, or why membership of the society should be a privilege reserved for muslims. here the religious enthisiast seems to have knocked out the philospher a result which is logically wrong but pwetically right

ہم میں سے اکثر نکلسن کی رائے کے ساتھ متفق ہوں یا نہ ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ نکلسن نے اقبال کے جن خیالات پر کسی قدر اظہار حیرت کیا ہے وہ آج بھی اقبال کے نظام فکر میں اقبال کے اکثر نقادوں اور مداحوں کے لیے ایک امر متنازعہ فیہ کی حیثیت رکھتے ہیں اقبال کے یہ خیالات اکثر مستشرقین کے لیے ہمیشہ ایک سوالیہ علامت کی صورت میں رہے اور کسی نہ کسی طرح مستشرقین اس کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فراہم بیلی A

history of urdu literature(1932)میں لکھتے ہیں:

He sings the praises of muslim achivement for he is not a national but a muslim patriont, one who has imbibed some of the culture of west, but hold himself rather aloof, not so much antagonistic to it as sespicious of its effect on his co religionists.

دراصل گراہم بیلی اس عقدے کو جو خود نکلسن اور گراہم بیلی کے سامنے آیا کھولتے کھولتے رہ گئے ہیں جہاں تک میرا خیال ہے گراہم بیلی کی نظر سے Reconstruction of religious thought in islam نہیں گزری ہوگی یا ممکن ہے چونکہ ان کا مقصد اردو ادب کی تاریخ لکھنا تھا اس لیے انہوں نے اپنا مطالعہ اقبال کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' ہی تک محدود رکھنا کافی سمجھا ہو حالانکہ 1924 سے تین سال قبل Reconstruction of religious thought in islam چھپ چکی تھی اگر گراہم بیلی اس کتاب کا مطالعہ کرتے تو شاید اقبال کی مندرجہ ذیل تحریر میں کہیں نہ کہیں انہیں اپنے سوال کا جواب نہ سہی اس کی ایک جھلک ہی نظر آجاتی:

dnring the last five hundred years religious thought in islam has been practically stationary there was a time when eurpron thought recived

inspiration from the world of islam. the most remarkable phenomenon of modren history, however, is the enormous rapidity with which the world of islam is spiritually moving towards the west. there is nothing wrong in this movement for eurpron culture, on its intellectual side, is only a further development of some of the most important phases of the culture of islam. our only fear is that the dazzling exterior of eurpron culture may arrest our movement and we may fail to reach the true inwardness of that culture.

میرے نزدیک اقبال کی اس تحریر میں پروفیسر نکلسن کے اس اعتراض کا جواب بھی موجود ہے جو انہوں نے دبی زبان میں اپنے مذکورہ مقالے میں یہ کہ کے کیا ہے

He knows goethe byron and shelley he is as pamiliar with also sprach qorathustra and l evolution creatice as he is with the quran and the mathnwi but with the humanistic foundation

of eurpeon culture he appeares to be less initimately acquainted and we feel that his critism thought never superficial, is sometimes lacking in breadth.

ویسے اپنے اس اعتراض کا جواب نکلسن کے اسی مقالے میں موجود ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

While iqbal has been profoundly influenced by the western culture his spirit remains essentially oriental

---

Reconstruction 2، ص7

اس نکتے کی وضاحت خود اقبال کے الفاظ میں دیکھیے اپنے ایک لیکچر میں لکھتے ہیں

the task before the modern muslim is, therefore. immense he has to rethink the whole system of islam without completly breaking with the past the only course open to us in to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of islam in the light of that

knowledge, even though we may be led to differ from those who have gone before us.

فکر اقبال کا یہ ایک ایسا پہلو ہے جس پر مستشرقین نے تو کیا خود ہندوستان اور پاکستان کے اکثر طلبائے اقبالیات نے کام کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی حالانکہ فکر اقبال کا یہی پہلو سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے لیکن دو چار خاور شناس، جنہیں میں مستشرق نہیں کہوں گا اور جن کے ناموں کا ڈنکا بھ نکلسن اور آربری کی طرح ہندوستان یا پاکستان میں نہیں بجا ایسے بھی ہیں جنھوں نے فکر اقبال کے اس پہلو کی طرف کام کرنے کا اشارہ کیا ہے ان میں ایک ہیں جے کلووڈ روم جو The poet of the east کی تمہید میں لکھتے ہیں

only those who are qualified by a close study of the quran can say how far iqbal maintained inviolate the spirit of the teachings of the quran. but there can be no question that he has widend the horizon of islamic thought and revealed unsuspected resiliency in to it to the precure of the changes through which the world passing today. iqbal has demolished once for all the bizarre structure which the hair spliting interpreters of the teachings of islam

and the involved system of thought of some of the sufis erected for islam he has attempted to restore to islam the grandeour of its simplisity. time alone will show if he has suc-

---

3ملاحظہ ہو Reconstruction of religious thought in islam کا لیکچر The human ego: his freedom and immprtality

---

ceeded. but the irresistible appeal of the dry from his heart for directness in the interpretations of the teachins of islam is already producing changes in muslim outlook which promises to rationalise in islamic countries.

اسی تمہید میں جے سی روم ایک قدم اور آگے جاتے ہیں اور اقبال کے فکری سرچشموں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

How far the stream of iqbals thought was influenced by the current of hindu thought as it was by the current of islamic and western thoughts, is difficult to say, but the fearlessness

with which he plunged in to unfathomable depths and the consitency with which he upheld the dedicates of reason seem the suggest that the force of generations of hindu thought which formed the warp of his mind even if covered with islamic thought was not extinct.

دوسرے خاور شناس اس ضمن میں ولیم او ڈگلس ہیں جنہوں نے واشنگٹن میں متعدد اجلاس کی صورت میں اقبال کی شاعری اور فلسفے پر بحث کے لیے ایک فضا پیدا کی اور جو اقبال کی شاعری اور فکر و فن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

the most remarkable phenomenon of modern history to iqbal was the new spiritual understanding between the east and the west......... iqbal was a voice from the east that found a sommon denominator with the west and helped build the universal community thar tolerates all differences in race, in creeds, in language.

پروفیسر آرتھر آربری کا ذکر اس مقالے کے شروع میں آچکا ہے نکلسن کی طرح

اقبال پر آرتھر آربری کے کام کا کینواس بھی خاصا وسیع ہے ''زبور عجم'' کا انگریزی ترجمہ Persion psalms ''پیام مشرق'' کے حصہ رباعیات لالہ طور کا ترجمہ Tulip of sinai ''شکوہ و جواب شکوہ'' کا ترجمہ Complaint and answer ''رموز بے خودی'' کا ترجمہ My steries of selfessness اور ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ ان کے ایسے کام ہیں جو اقبالیات کے سلسلے میں ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے یہاں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ جس طرح ''اسرار خودی'' کے ترجمے میں پروفیسر نکلسن سے بعض اغلاط سرزد ہوئیں اسی طرح آرتھر آربری کے انگریزی ترجمے میں بھی کہیں کہیں اغلاط موجود ہیں جن کا مختصر سا ذکر میں ایک طویل مقالے میں، جو چند برس ہوئے ماہ نامہ ''شب خون'' الہ آباد میں شائع ہوا تھا، کر چکا ہوں، لیکن جیسا کہ میں نے اس مقالے میں ذکر کیا ہے، اس ترجمے کی قدر و قیمت محض چند اغلاط کی بنا پر کسی طرح کم نہیں ہو سکتی اس میں محاسن کا پلڑا کہیں بھاری ہے اور آرتھر آربری کے قلم کی جولانی اور شگفتگی جو اول سے آخر تک جادو جگاتی چلی جاتی ہے ترجمے کے ادب کی ایک بیش بہا متاع ہے اردو اور فارسی غزل کا ترجمہ انگریزی یا کسی بھی زبان میں خاصا مشکل سمجھا گیا ہے اس معاملے میں آرتھر آربری جس کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابل توصیف ہے ترجمے کے آخر میں قرآن اور حدیث کے حوالے اس امر کی دلالت کر رہے ہیں کہ آربری کا عربی زبان اور اسلامیات کا مطالعہ قابل رشک ہے۔

''زبور عجم'' اور ''جاوید نامہ'' کے ترجموں کی تمہید میں آرتھر آربری نے اقبال

کے فکر وفن پر بڑی عالمانہ بحث کی ہے اور ترجمے کے متعلق قاری کو خاص اہم نکتوں سے روشناس کیا ہے اس تمہید میں آپ نے شیخ محمود احمد، پرنسپل گورنمنٹ کالج میر پور کے انگریزی ترجمہ جاوید نامہ کے ذکر میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

جہاں تک مطالعہ نظم ونثر اقبال کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ آرتھر آربری نے اقبال کا ایک ایک لفظ بغور پڑھا ہے یہاں تک کہ جاوید اقبال کی مرتب کی ہوئی اقبال کی ڈائری Stray reflections تک کا حوالہ بھی انہوں نے دیا ہے۔

مجھے آرتھر آربری کی یہ احتیاط بہت پسند آئی ہے کہ انہوں نے ''جہاں دوست'' کو انگریزی میں بھی ''جہاں دوست'' ہی لکھا ہے اور غیر محتاط ترجمین اقبال کی طرح جہاں دوست کا لفظی ترجمہ کر کے اسے وشوامتر نہیں لکھ دیا۔ یہ دراصل شوجی مہاراج کا ذکر ہے شوجی مہاراج کے ساتھ اقبال کے سوال وجواب اگر اقبال کی شاعری میں ایک مے خانہ الہام کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا انگریزی ترجمہ آرتھر آربری کے فن کی بدولت مے دو آتشہ کی صورت اختیار کر گیا ہے اس حصے میں آرتھر آربری سے صرف ایک لغزش ہوئی ہے اقبال جب کہتے ہیں

گفت ''حجت چیست؟'' گفتم ''روے دوست''

تو یہاں ''حجت'' کا لفظ ایک مکمل سوال کی صورت میں آیا ہے یعنی عرفان و ایقان کے حصول کا ذریعہ ہے آربری نے یہاں ''حجت'' کا لفظی ترجمہ Proof لکھ دیا ہے لیکن اس قسم کی لغزشیں سمندر میں قطرے کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں۔

ایساندر بسانی عارف اقبال بھی ہیں اور عاشق اقبال بھی ''جاوید نامہ'' کا اطالوی زبان میں ترجمہ جو روم سے 1952 میں شائع ہوا انہی کے قلم کا مرہون

منت ہے ویسے بھی جہاں تک اقبالیات کا تعلق ہے بسانی نے زیادہ تر کام جاوید نامہ ہی پر کیا ہے انہوں نے دانتے کی ڈیوائین کامیڈی اور جاوید نامہ کا ایک تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے عربی بہت اچھی جانتے ہیں اور اقبال پر جب لکھتے ہیں تو اپنی تحریروں کو جابجا آیات قرآنی سے مزین کرتے ہیں۔

خاور شناسوں میں ولفرڈ کانٹ ویل اسمتھ کا بہت بڑا نام ہے ان کی کتاب جس کا پہلا ایڈیشن تقسیم ہند سے قبل Modern islam in india کے نام سے اور دوسرا ایڈیشن تقسیم ہند کے بعد Modern islam in india and pakistan کے نام سے چھپا ایک ایسی کتاب ہے جسے ہندوستان اور پاکستان میں سیاسیات یا سماجیات کا کوئی طالب علم نظر انداز نہیں کرسکتا اس کتاب میں اقبال کے متعلق دو باب ہیں ایک کا عنوان ہے iqbal the progressive اور دوسرے کا ہے Iqbal the reactionary میں سمجھتا ہوں کانٹ ویل اسمتھ نے اس عمارت کی تعمیر میں خشت اول ہی ٹیڑھی رکھی ہے ایک شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کرنا نفسیاتی تجزیے میں ممکن ہوتو ہو فکری یا فنی اعتبار سے ممکن نہیں دراصل اقبال اتنے بڑے شاعر تھے کہ ہر جماعت اور فرد کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اتنے بڑے شاعر تھے کہ ہر جماعت اور ہر فرد کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ اقبال کو اپنے نظام فکر کے سلسلے سے وابستہ شاعر و مفکر ثابت کرسکے۔

کانٹ ویل اسمتھ کا شمار ایسے ہی اقبال پسندوں میں ہوتا ہے۔اسمتھ چونکہ خود سوشلسٹ بلکہ کمیونسٹ ہیں اور کمیونسٹ بھی ایک وسیع المطالعہ، اور وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اقبال کو سوشلسٹ کہنا آسان نہیں، اس لیے انہوں نے جا بجا اس طرح کی

لفاظی کا سہارا لیا ہے ''جذباتی اعتبار سے اقبال سوشلسٹ تھے'' ذہنی اعتبار سے وہ سوشلسٹ نہیں تھے'' وہ تجزیاتی طور پر یہ نہیں جانتے تھے کہ سرمایہ داری میں کیا خرابی ہے'' ''انہوں نے اشتراکیت کے بارے میں مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے'' ''ان کی تحریروں سے سوشلسٹ قسم کا تاثر جھلکتا ہے'' ''آخر میں انہوں نے کئی اشتراکیانہ نظمیں کہیں اور انہوں نے مغربی تہذیب کی مخالفت میں کارل مارکس کا نام استعمال کیا'': ''لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ انہیں اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ اشتراکیت کیا ہے'' یہ ایک طرح سے بے سروپا باتیں ہیں اور ایک ایسے طالب علم کے لے جو صدق دلی سے اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے کوئی رہ نمائی نہیں کرتیں اقبال کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اشتراکیت کیا ہے اور پھر ان کے کلام کو اشتراکیانہ قرار دے کر اس پر بحث کرنا اقبال کو ان کی شخصیت سے باہر لے جا کر دیکھنے کی کوشش ہے کسی بھی فن کار کا مطالعہ اس کی شخصیت سے باہر جا کر نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر اس سلسلے میں خلط مبحث سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''پیام مشرق'' میں اقبال لینن کو قیصر ولیم کی پست سطح پر لے آئے ہیں ان کا اشارہ نظم موسوم بہ ''موسیو لینن و قیصر ولیم'' کی طرف ہے اس نظم سے یہ اندازہ لگایا کہ قیصر ولیم کو اقبال نے کسی پست سطح پر رکھا ہے خواہ مخواہ کی کھینچا تانی ہے اس نظم میں اقبال نے نہ تو قیصر ولیم کو کسی پست سطح پر دکھایا ہے اس نظم میں اقبال نے نہ تو قیصر ولیم کو کسی پست سطح پر دکھایا ہے اور نہ لینن کو قیصر ولیم اور لینن پہلی جنگ عظیم کے دو کردار ہیں ایک کے لیے جنگ زوال کا اور دوسرے کے لیے عروج کا باعث بنی خیر کہنا میں یہ

چاہتا ہوں کہ کانٹ ویل اسمتھ نے اپنی مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر تاثیر کا یہ فقرہ نقل کیا ہے لیکن اپنی طرف سے اس میں لفظ ''جہنم'' کا اضافہ کر دیا ہے اور فقرہ یوں مکمل کیا ہے کہ ''اقبال لینن کو جہنم میں قیصر ولیم کی سطح پر لے آئے ہیں''معلوم نہیں اسمتھ نے یہ لفظ ''جہنم'' کہاں سے شامل کیا ہے کیونکہ یہ لفظ نہ تو کہیں اقبال کی نظم میں آیا ہے اور نہ ڈاکٹر تاثیر کی مذکورہ تحریر ہیں۔

کانٹ ویلی اسمتھ کے الفاظ میں ''اقبال اقتصادیات اور سماجیات سے بھی نا واقف تھے اور اسی ناواقفیت کی بنا پر وہ ہندوستان اور اسلام میں ان جماعتوں کو نہ پہچان سکے جو دراصل انہی کے مقاصد کی ترجمانی کرانی تھیں اپنی عملی زندگی میں انہوں نے انہی جماعتوں کی مخالفت کی اور ان جماعتوں کی حمایت کی جو ان کے مقاصد کے خلاف کام کر رہی تھیں''لیکن اقبال پر یہ اعتراض کرتے وقت اسمتھ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اقبال کے سامنے مسلمانوں کی بہبود کا ایک اپنا تصور تھا پہلے تو اقبال کو کھینچ تان کے سوشلسٹ ثابت کرنا اور پھر ان کے سوشلزم پر اعتراض کرنا اور یہ کہنا کہ وہ سوشلزم کے بارے میں یہ نہیں جانتے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے ایک مہمل قسم کی تنقید ہے ہاں اقبال کے بعض اشعار کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال مغربی یورپ کے جمہوری نظام پر اشتراکی نظام کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر نظام سمجھتے ہیں اس لیے کانٹ ویل اسمتھ اقبال کو سوشلسٹ کہ کر ان پر سوشلزم سے ناواقف ہونے کا اتہام لگانے کے عوض اگر اقبال کو سوشلسٹ نہیں بلکہ مسلمان تسلیم کریں تو خلط مبحث کا بڑی حد تک بدل جائے گی انہیں اس بات کا تو حق ہوگا کہ اسلام کے

مقابلے میں اشتراکی نظام کو بہتر قرار دیں لیکن یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہوگی کہ اقبال تھے تو سوشلسٹ لیکن سوشلزم کی حقیقت سے بے خبر تھے۔

وکٹر کرنین نے اپنی توجہ اقبال کی اردو نظموں ہی پر مرکوز رکھی ہے وکٹر کرنین کی کتاب Poems from iqbal جو اقبال کی بعض منتخب اردو نظموں کے ترجموں پر مشتمل ہے شعری ترجموں کی مقبول ترین کتابوں میں ہے اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ یہ اقبال کے شعوری ارتقا کی ایک جامع تصویر پیش کرتی ہے مترجم نے ان ترجموں میں صرف قافیے کی اسکیم ہی کو برقرار نہیں رکھا بلکہ کوشش یہ کی ہے کہ اصل نظم کے وزن کا آہنگ بھی ترجمے میں برقرار رہے۔ بعض ترجمے جس میں اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ترجمہ بھی شامل ہے نہایت عمدہ ترجمے ہیں

فرانسیسی خاورشناسوں میں ایوا میرووچ اور لیوی کلا دمیترے کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے اول الذکر خاتون کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے Reconstruction of Religious thought in islam کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے اور Development of Metaphysicd in persia کے ترجمے میں مصروف ہیں اس کے علاوہ انہوں نے محمد مقری کے ساتھ مل کر ''پیام مشرق'' کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے اور ثانی الذکر نے فکر اقبال پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا انگریزی ترجمہ مولانا عبدالمجید ڈار، بیرسٹر ایٹ لا،لاہور نے Introduction to the thoughts of iqbal کے عنوان سے کیا ہے یہ کتاب جو آٹھ ابواب ''His life and works'' ''His philosphy of personality'' ''the perfect man'' ''The ideal

Metaphysics and philosophy of ""society

The """Iqbal and oriental Thoughts"""religion

ghazals""اور""The poet""پر مشتمل ہے اقبالیات میں ایک گراں بہا

اضافہ ہے دراصل یہ کتاب فکر اقبال کے بارے میں ہے شاعر اقبال پر آخر میں

ایک باب ہے جس میں فاضل مصنفہ نے اقبال کی فلسفیانہ شاعری اور غزلیہ شاعری

کا تجزیہ کیا ہے۔

مس شیلا میک ڈولو سر جارج ولیم یونی ورسٹی، مونٹریال (کینیڈا) میں دینیات

کی اسسٹنٹ پروفیسر ہیں Pakistan and the west ان کی ایک مشہور

کتاب ہے انہوں نے میک گل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز سے پی ایچ ڈی

کی ڈگری حاصل کی ہے اسلامیات اور اقبالیات سے انہیں خاصی دلچسپی ہے اقبال

کی نظم ''مسجد قرطبہ'' پر ان کا مقالہ اقبالیات اور ادبیات میں بڑی اہمیت کا حامل

ہے اس مقالے میں شیلا میک ڈولو نے اقبال اور ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری کا

موازنہ کیا ہے۔

ایوا میورو وچ، لیوسی کلادمیترے اور شیلا میک ڈولو کے بعد صنف نازک کی

فہرست میں دو بہت ہی اہم نام آتے ہیں ان میں ایک ہیں روسی مصنفہ میں ایم ٹی

اسٹیپنٹس اور دوسری ہیں جرمن مصنفہ این میری شمل۔

مس ایم ٹی اسٹیپنٹس نے اپنی کتاب Pakistans Philosphy

and Sociology میں اقبال کا فکری رشتہ شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان کے

ساتھ ملایا ہے اس کتاب کے انگریزی ترجمے میں جو ایک روسی مصنف آرکوس

ٹیوک نے کیا ہے ہمیں اقبال اور مغرب کے تعلق سے یہ عبارت نظر آتی ہے

And iqbal himself did take from from the west whatever corresponded most to the basic premisses of his philosophical conception he made if his goal to create a system om modernised islam and tried to prove that the philosphy of islam was not outdated but merely needed to have its principles expressed in the teminology and ideals of the new times. from the permiss it remained for him to find points of contect between muslim philospohy and the modren theories of the west he intrested himself for instance, in the quasilogical ideas of bergson, which he found similar to those of rumi the letter in his opinion had anticipated wedtern philosophers, especially bergson, in his treatment of the relation between intellect and intution.

Some scholars would have it the iqbals

philosphy is a sort of carbon copy of Neitzscgeism. prof E G Browne of great britian has even called it an oriental adaptation of Neitzscheism other scholrs take the dramitically opposite view, completely denying any neizsdhean influence on the muslim reformer and seeing nothing as sommon between them.

اس قسم کے خیالات پر میں اپنی کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' میں اور اپنے طویل مقالے ''اقبال کا تصور زمان و مکاں'' میں مفصل بحث کر چکا ہوں اس لیے اس بحث کو یہاں دہرانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ مختصراً اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں آرا انتہاپسندانہ ہیں جہاں تک نیٹشے کا تعلق ہے اقبال اور نیٹشے کے افکار میں قرب کی بہ نسبت بعد کہیں زیادہ ہے۔

اقبالیات کے تعلق سے مس اسٹیپشنس کا ایک خاص موضوع ہے اقبال کے نظام فکر میں اخلاقیات کا مقام اس ضمن میں ان کا مقالہ Problems of ethics in Mohammad iqbal,s philosphy کیفیت و کمیت دونوں کے اعتبار سے اقبالیات میں بلند مقام کا حاصل ہے۔

اب آخر میں اس مستشرق خاتون کا ذکر کروں گا جس نے اقبال کے متعلق دنیائے ادب میں مقالات اور تقریروں کا مینہ برسا دیا ہے اور وہ ہے

Gabriel,s wing کی مصنفہ اینے میری شمل یہ جرمن خاتون جو یونی ورسٹی آف بون میں پروفیسر رہ چکی ہیں آج کل امریکہ میں ہیں اور اقبال کے فکروفن پر لیکچروں کے سلسلے میں کئی بار ہندوستان اور پاکستان کا سفر کر چکی ہیں۔

اینے میری شمل کی کتاب Gabriel,s Wing ''بال جبریل'' کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اقبال کے مذہبی افکار کا ایک مطالعہ ہے یہ کتاب Studies in the History of Religious(Suppelement to Numens) کے سلسلے کی چھٹی کتاب ہے جو 1923 میں لیڈن (نیدرلینڈز) میں چھپی چار سو اٹھائیس صفحات کی یہ کتاب مندرجہ ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

A)The Historical Background

b) His Life

c) The Aesthetic Side of His work

d) the religious Motives

His interpretation of Five Pillars of Faith

a) There is no god but god

b) Mohammad is the Messenger of God

c) Prayer

d) Fasting, Zakat, Pilgrimage and Jihad

His interpretations of the Essentials of Faith

a) L belive in God and in His angels

b)...... and in his books

c) ......and in his Messengars

d).......and in the last day

(e)..... and in the predestination the Good and Evil both come from god

iv Some Glimpses of western and eastern influedce on Iqbals, thought and on His Relations to Mystcs and Mysticism

v To sum up

یہ کتاب اول سے آخر تک کلام اقبال اور فکر اقبال کے ساتھ اپنے میری شمل کی شدید دل چسپی کی داستان سناتی ہے مصنفہ کا علم وفضل ایک ایک سطر سے نمایاں ہے اور کہیں کہیں انگریزی زبان کی اسقام کے باوجود بحیثیت مجموعی ساری کتاب کی عبارت قاری کو بدرجہ اتم متاثر کرتی ہیں کہیں کہیں زبان کی اسقام کی جو بات میں نے کی ہے اس کے متعلق دراصل میں اپنے میری شمل کے ان جملوں کے بعد کہ

I apologize for the Engilsh style of the present book.... I am afraid that in spite of the help uf some friends who did their best to brush up the style, some clumsy phrases of

awkward expressions have not yet been removed

کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ویسے بھی میرے لیے اپنے میری شمل کی زبان پر تبصرہ کرنا اس لیے نامناسب ہے کہ انگریزی نہ ان کی اپنی زبان ہے نہ میری۔

اپنے میری شمل شاعرہ بھی ہیں اس لیے اس کتاب کا انداز بیان اکثر جگہوں پر شاعرانہ ہو گیا ہے یہ انداز بیان اگرچہ کتاب کی دل کشی میں اضافہ کرتا ہے لیکن تحقیقی اور تنقیدی نثر کے لیے یہ انداز بیان مناسب نہیں

یہاں ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ یہ کتاب اقبال کے مذہبی افکار کے متعلق ہے لیکن اقبال کی شاعری پر کام کرنے والوں کے لیے بھی اس میں نہایت مفید نکتے موجود ہیں، مثلاً ڈاکٹر موصوفہ دیباچے میں لکھتی ہیں:

Nearly nobody has made until now a simple careful anaytical index of the motifs of symbols, iqbal uses in his poetry or of the meters he prefers, in short of his poetical thchnique.

ویسے اس کتاب کا جو مقصد ہے وہ مصنفہ کے ان الفاظ میں دیکھیے۔

The aim of the present book is not to add some more theories to those already existing. it will simply show iqbals view of the essentials of islam i e the five pillars of faith and the dreed

which is taught to every muslim child.

ڈاکٹر شمل علم کا سمندر ہیں اور تاریخ مذاہب عالم پر ان کی گہری نظر ہے یہ دونوں باتیں Gabriel,s Wing میں جابجا نظر آتی ہیں اس کے باوجود تحقیق کے معاملے میں ان سے بعض کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں جن کی تصحیح کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں ضروری ہے مثلاً یہ بات پا چکی ہے کہ شیخ عطاءاللہ کی مرتبہ ''مکاتیب اقبال'' میں ڈاکٹر لمعد کے نام اقبال کے جو خطوط درج ہیں وہ سب کے سب جعلی ہیں ان میں سے کسی ایک بھی خط کے متعلق اس بات کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ واقعی یہ خط اقبال نے ڈاکٹر لمعد کے نام لکھا ہے میں خود بھی ایک مدت تک ان خطوط کے متعلق غلط فہمی کا شکار رہا ہوں لیکن اب جب کہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں تو اقبال پر کام کرنے والوں کو چاہیے کہ ان خطوط کو قطعاً نظر انداز کر دیں

ڈاکٹر موصوفہ صفحہ 142 پر لکھتی ہیں

His introduction to the first edition of Rumuz gives an impression of what he aimed at

اس کے بعد مندرجہ ذیل اقتباس درج ہے

Just as in the individual life. the acquisition of qain, protection against injury, determination for action and appreciation of higher values are all dependent on the gradual development of

the ego conscionusness its continuty, enhacement and consideration, similarly the secret of the life of nations and people depends on the same process which can be described as the development, presntation and sonsolidation of the communal ego.....

یہ سارا اقتباس کوئی اڑھائی سو الفاظ پر مشتمل ہے نہ جانے ڈاکٹر موصوفہ نے اقبال کی کون سی اردو نثری تحریر کا اقتباس اس ترجمے کی صورت میں پیش کیا ہے ''رموز بے خودی'' کے دیباچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح بھی ضروری ہے

لیکن یہ معمولی فروگزاشتیں اپنے میری شمل کی کتاب Gabriels wing کی اہمیت کو کسی طرح کم نہیں کرتیں بلکہ اس کی حیثیت ایک دلیل راہ کے طور پر برقرار رہتی ہے۔

اپنے میری شمل نے ''جاوید نامہ'' کا جرمن زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے اس کے علاوہ اقبالیات کے تعلق سے ایک اور نایاب مسودہ بھی ان کے پاس ہے اور وہ ہے ''پیام مشرق'' کے بعض حصوں کا جرمن ترجمہ جو ارلینگن یونی ورسٹی کے پروفیسر ہیل نے کیا تھا لیکن اس سے قبل کہ اس ترجمے کو چھپنے کی نوبت آتی پروفیسر ہیل کا انتقال ہو گیا میں نہیں کہہ سکتا یہ ترجمہ اس وقت تک چھپ چکا ہے یا نہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

IQBAL REVIEW

JOURNAL OF THE IQBAL ACADEMY PAKISTAN

This Journal is devoted to research studies on the life, poetry and thouht of iqbal and on those branches of learning in which he was intrested: Islamic studies, Philosophy, History, Sociology, Comparative Religion, Literature, Art, and Archealogy

Published alternatily

in

English (april and October) and urdu

(january and july)

Subscription

(for four issues)

Pakistan Rs 15.00

Foreign countriesd Us$ 5.00 or Stg.1.75

Price per copy Rs 4.00

Us$ 1.50 or Stg.0.50

all contributions should be addressed to the secertary, Editorial Board, Iqbal Review, 116 Mcleod Road, Lahore. Each article must have its duplicate copy. the academy is not responsible for the loss of any article

published by

Dr M. Moizuddin, Editor and secertry of the editorial Board of the Iqbal review and director, Iqbal academy pakistan, Lahore.

Printed at

ZARREEN ART PRESS

61, Railway road, Lahore

محمد عبداللہ قریشی

روح مکاتیب اقبال

علامہ اقبال کی ہمہ گیر شخصیت کے گوناں گوں پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ان کے نجی اور ذاتی خطوط کے عظیم سرمائے کو سب سے اہم کلیدی حیثیت حاصل ہے انسان سرگوشیوں میں بارہا ایسی باتیں کر جاتا ہے جن کو مصلحت، تہذیب، دور اندیشی، اصول، اخلاق یا کسی خاص کمزوری کی بنا پر شاید کھلم کھلا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بعض اوقات اپنے کسی فعل کے اسباب عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے سے ہچکچاتا ہے، لیکن مخصوص احباب کی مجلس میں بے جھجک بیان کر دیتا ہے ایسے میں کسی کی افتادِ طبع کا اندازہ لگانے، اس کے اصلی اخلاق، اس کی حقیقی نیت اور اس کی بے لاگ رائے معلوم کرنے کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں کہ جہاں تک ہو سکے اس کے ذاتی اور ایسے افعال کی تلاش کی جائے جو اس سے ایسی حالت میں سرزد ہوئے ہوں جب کہ اس کو یقین ہو کہ دوسرا کوئی ان سے واقف نہیں ہو سکتا۔

''روح مکاتیب اقبال'' حضرت علامہ کے کم و بیش ساڑھے بارہ سو خطوں کا نچوڑ ہے جو پھول جس گلدستے سے چنا ہے اس کا حوالہ دیا گیا ہے تا کہ شائقین اصل تک بآسانی پہنچ کر پورا خط حاصل کر سکیں ہر پھول کا رنگ جدا اور خوشبو علیحدہ ہے، مگر سب مل کر کچھ اور ہی لطف اور کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

اب تک شائع شدہ تمام مجموعہ ہائے مکاتیب کوتاریخ وارترتیب دے کر ہر خط کی اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر کے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

صفحات 248 اشاریے، قیمت 72 روپے

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اقبال اکادمی، پاکستان

116 میکلوڈ روڈ لاہور

☆☆☆☆☆☆

ختم شد